اسلام پر حملہ کرنے اور مغربی ثقافت کو مستحکم بنانے کے لیے

خطرناک تصورات

حزب التحریر

پہلا ایڈیشن: ۱۴۱۹ھ - 1998م

(اردو ترجمہ)

1427ھ - 2007م

﴿هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَه‘ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَه‘
عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ﴾

”وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تا کہ وہ اس دین کو باقی تمام ادیان پر غالب کر دے، خواہ مشرکین کو یہ بات نا گوار ہی ہو“

(التوبہ: 33)

فہرست

ابتدائی آیت	3
تمہید	5
دہشت گردی	8
بین المذاہب مکالمہ	14
سمجھوتہ	32
بنیاد پرستی	38
گلوبلائزیشن (عالمگیریت)	43

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید:

اچھائی اور برائی یا حق اور باطل کے کے درمیان جاری مسلسل کشمکش ایک اٹل حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسانوں کے مابین یہ جدوجہد حق اور اچھائی کی فتح اور باطل اور برائی کی شکست پر منتج ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ﴾

''اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا، تو تمام تر زمین فساد سے پُر ہو جاتی'' (البقرۃ: 25)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بِعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوَاتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ﴾

''اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو اپنے اپنے زمانے میں نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہودیوں کی عبادت گاہیں اور مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے، سب منہدم ہو گئے ہوتے'' (الحج: 40)

چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسلامی ریاست کے قیام کے لیے مشرکین اور دوسرے کفار کے خلاف ایک فکری اور سیاسی جدوجہد کے علاوہ، ریاست کے قیام کے بعد ایک شدید عسکری جدوجہد کا بھی آغاز کیا، تاکہ اسلام کو ہدایت وحق کے پیغام کے طور پر پوری انسانیت تک پہنچایا جا سکے۔ کفار ہمیشہ سے ہی اسلامی ریاست کے خلاف منصوبہ بندی کرتے آئے ہیں۔ کبھی انہوں نے جنگ کا راستہ اپنایا، جیسا کہ منگولوں، صلیبیوں اور سپین کے کفار نے

کیا، تو کبھی انہوں نے فکری اور ثقافتی حربے اپنائے جیسا کہ زندیقوں، مشنریوں اور مستشرقین نے کیا، تا کہ اس خلافت کو تباہ کیا جا سکے، جو اسلام کو نافذ کرتی ہے اور جس کا سربراہ خلیفہ ہوتا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد کفار اپنے مقصد میں کامیاب ہوگے۔ انہوں نے خلافت کو تباہ کر دیا، خلیفۂ وقت کو جلاوطن کر دیا اور اسلامی سرزمین کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا اور پھر ان ریاستوں میں کفر احکامات نافذ ہونے لگے۔ انہوں نے یہ سب کچھ یہ سوچ کر کیا کہ ایسا کرنے سے اسلام ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے دلوں سے مٹ جائے گا۔

لیکن اب امتِ مسلمہ کے مخلص اور اللہ پر یقین رکھنے والے باخبر بیٹوں کی بدولت، امتِ مسلمہ میں نشاۃِ ثانیہ کا احساس دوبارہ جنم لے چکا ہے۔ کفار مما لک اب اس بات کو سمجھ چکے ہیں کہ اسلام کی طاقت اس کے انتظامی ڈھانچے تک محدود نہیں ہے اور محض چند کمزور مسلمانوں کو مغربی تہذیب کی چمک دمک کی طرف مائل کر لینے سے وہ اپنے مقاصد کی تکمیل نہیں کر سکیں گے۔

بہت سوچ بچار اور تحقیق کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام اور مسلمانوں کی اصل طاقت اسلامی عقیدے اور اُس سے پھوٹنے والے افکار میں ہے۔ چنانچہ کفر مما لک نے اپنے لائحہ عمل پر نظر ثانی کی ، تا کہ اپنے سرکاری اداروں اور ایجنٹوں یعنی مسلم مما لک کے حکمرانوں اور مفکرّین میں موجود اپنے آلہ کاروں ، کے ذریعے اسلام کے عقیدے کو بطور سیاسی عقیدہ ختم کر کے اسلام کو مٹا دیا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ دین اور دنیا کی جدائی کا عقیدہ اسلام کے عقیدے کی جگہ لے لے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے قومیت، سوشلزم، جمہوریت، تکثیریت (Pluralism)، انسانی حقوق، آزادی (Freedom) اور آزاد تجارتی پالیسی (Free Market Policies) جیسے تصورات کو بنیاد بنایا اور انہیں فروغ دینا شروع کر دیا۔ (ان خطرات اور ان کے جھوٹ کو کتاب ''اسلام کو تباہ کرنے کی امریکی مہم'' میں بیان کیا جا چکا ہے)۔

اس کے بعد کفار نے چند مزید افکار کو پیش کیا اور ان کے فروغ کے لیے عمل کرنا شروع

کیا، جیسا کہ مذاہب کے مابین مکالمہ، اور بین الثقافتی مکالمہ اور یہ نقطۂ نظر کہ عرب اور یہودی دونوں ابراہیمؑ ہی کی اولاد ہیں۔ انہوں نے دہشت گردی، بنیاد پرستی اور انتہا پسندی جیسے افکار کے ذریعے اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش شروع کر دی، چنانچہ یہ بہت اہم ہے کہ ہم ان افکار کی اصل حقیقت اور امتِ مسلمہ کے لیے ان تصورات میں موجود خطرات کو بیان کر دیں، تاکہ وہ ان تصورات سے خبردار رہے اور ان کی جانب صحیح رویہ اختیار کرے۔ یہ خاص طور پر اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسلام کی ایک عالمی آئیڈیالوجی اور ایک سیاسی نظام کے طور پر واپسی، جسے خلافت پوری دنیا تک پھیلائے گی، اب ایک ناگزیر بات بن چکی ہے۔ اور اس بات سے نہ صرف وہ مسلمان واقف ہیں جو اسلام کی خاطر متحرک ہیں بلکہ تمام امتِ مسلمہ یہاں تک کہ اسلام کے وہ تمام دشمن، جو اس دین اور اس دین کی حامل امت کی خلاف سازشیں تیار کرتے رہتے ہیں، بھی یہ بات سمجھ چکے ہیں۔

ان افکار پر بات کرنے کا مقصد ان افکار میں موجود خطرات کو بیان کرنا اور اِن کے بودے پن کو بے نقاب کرنا ہے، اور ان افکار پر بات کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ محض ان افکار کی وضاحت کی جائے اور ان کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کر دیا جائے، بلکہ یہ اس طور پر ہے کہ یہ افکار دراصل کفار کی سازشوں کا حصہ ہیں، جن کی قیادت اس وقت امریکہ اور برطانیہ کر رہے ہیں۔ کفار اِن افکار کے ذریعے اسلام کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں اور خلافت کی واپسی کے لیے کام کرنے والوں کو روکنا چاہتے ہیں اور جب اللہ کے اذن سے خلافت دوبارہ قائم ہو جائے گی، تو تب بھی وہ ان افکار کو اسلام کے خلاف استعمال کریں گے۔

چنانچہ ہم پر لازم ہے ہم ان افکار اور ان ہتھکنڈوں کا پردہ چاک کریں تاکہ مسلمان جان سکیں کہ کفار نے اُن کے اور اسلام کے خلاف کیا سازشیں تیار کر رکھی ہیں۔ اس طرح یہ بات یقینی بنائی جا سکے گی کہ مسلمان پوری مضبوطی سے اپنے دین کو تھامے رکھیں اور رسول ﷺ کے راستے پر چلتے ہوئے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کے دوبارہ قیام کے لیے پوری سرگرمی سے محنت کرتے رہیں، تاکہ خلافت کا قیام اور ایک بار پھر اللہ کے دین کی بالادستی اُن کے ہاتھوں سے ہو سکے۔

اللہ نے قرآن میں اِرشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ﴾

''وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ وہ اِسے تمام ادیان پر غالب کر دے، خواہ مشرکوں کو یہ بات نا گوار ہی ہو'' (التوبہ: 33)

اگر ہم اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ اس ذمہ داری کو پورا کریں گے، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے والے کفار کے ارادوں پر پانی پھر جائے گا، اِن کی دولت تباہ و برباد ہو جائے گی اور ان کی قوت ختم ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اِرشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ لِيَصُدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَسَيُنۡفِقُوۡنَهَا ثُمَّ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ حَسۡرَةً ثُمَّ يُغۡلَبُوۡنَ﴾

''بے شک یہ کافر لوگ اپنے مالوں کو اس لیے خرچ کر رہے ہیں تا کہ اللہ کی راہ سے روکیں۔ سو یہ لوگ تو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہی رہیں گے۔ مگر پھر یہ مال ان کے لیے حسرت کا سبب بن جائے گا اور پھر آخر کار وہ مغلوب ہو جائیں گے۔ اور کافر لوگوں کو دوزخ کی طرف جمع کیا جائے گا'' (الانفال: 36)

1) دہشت گردی:

لغوی طور پر عربی کا لفظ ''اِلا رْھَاب'' (دہشت گردی) ایک اسم ہے، جسے فعل ''ارھَب'' سے اخذ کیا گیا ہے، اور اس کے معنی ہیں کسی کو خوف زدہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا:

﴿تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾

''اوراس کے ذریعے سے تم خوفزدہ رکھو، ان کو جو اللہ کے اور تمہارے دشمن ہیں'' (الانفال: 60)

اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دشمن کو خوف زدہ کرو۔

لیکن اب اس لفظ کے معنی کو تبدیل کر کے اسے ایک نیا معنی دیا جا چکا ہے۔ 1979 میں منعقد کردہ ایک سیمینار میں امریکہ اور برطانیہ کے انٹیلی جنس اداروں نے ''سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے عوامی مفادات کے خلاف تشدد کے استعمال'' کو متفقہ طور پر دہشت گردی کا نیا معنی قرار دیا۔

اس کے بعد بہت سی عالمی کانفرنس اور سیمینار منعقد کیے گیے اور ایسے قوانین تیار کیے گیے جن کی بدولت ایسے اعمال کا تعین کیا جا سکے جنہیں دہشت گردی تصّور کیا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کیا گیا کہ کسِ قسم کی تحریکیں، تنظیمیں اور جماعتیں دہشت گردی میں ملوث ہیں اور کون سے مما لک دہشت گردی کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ کفر مما لک کا یہ کہنا ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا تا کہ ایسے اقدامات اٹھائے جا سکیں جن سے دہشت گردی کا مقابلہ کیا جا ئے اور اس کے پھیلاؤ کو روکا جائے۔

دہشت گردی کے متعلق یہ قوانین واضح طور پر ناقص ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف ان قوانین میں اِن قوانین کو وضع کرنے والے مما لک کی سیاسی طرف داری شامل ہے۔ مثال کے طور پر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ امریکہ نے اندرا گاندھی کے قتل کو دہشت گردی کا عمل قرار دیا۔ جب کہ شاہ فیصل یا کینیڈی کے قتل کو ایسا قرار نہیں دیا گیا۔ اوکلاہوما میں ایف بی آئی کی عمارت کو دھماکے سے اڑانے کے عمل کو پہلے تو دہشت گردی قرار دیا گیا لیکن جب یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ اس دھماکے کے پیچھے چند امریکی عسکری گروپوں کا ہاتھ ہے تو امریکہ نے اس عمل کو دہشت گردی کی بجائے ایک عام مجرمانہ عمل کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا۔

نکاراگوا کے باغی آئی آوا ے اور چند دوسری تحریکیں ایسی ہیں جن کو خاص طور پر امریکا

عوامی تحریکیں قرار دیتا ہے۔ امریکہ 1977 کے جنیوا کنونشن کے پروٹوکول نمبر (1) کے تحت ان تحریکوں کے گرفتار ہونے والے جنگجوؤں کو جنگی قیدی تصور کرتا ہے۔ دوسری طرف ہر ایسی تحریک کو دہشت گرد قرار دے کر دہشت گرد تنظیموں کی فہرست میں شامل کر لیا جا تا ہے، جو امریکی مفادات کی مخالفت کرتی ہو۔ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے سرکاری طور پر شائع کی جانے والی اس فہرست میں مصر، پاکستان، فلسطین اور الجیریا وغیرہ کی متعدد تنظیموں کو باقاعدگی سے شامل کیا جاتا ہے۔

ستر کی دھائی سے امریکہ قومی اور عالمی سطح پر دہشت گردی کے متعلق اپنے نظریے کے مطابق رائے عامہ ہموار کرتا آیا ہے۔ اس نے بار بار ایسی حرکتوں کا فائدہ اٹھایا جن میں عام لوگوں کو نشانہ بنایا گیا ہو۔ خواہ یہ حرکتیں کچھ ایسی سیاسی یا عسکری تنظیموں کی ہوں جو امریکی خفیہ اداروں سے منسلک ہیں۔ مثال کے طور پر بہت سی رپورٹیں اس طرف اشارہ کرتی ہیں دہشت گردی قرار دیئے جانے والے چند اقدامات کے پیچھے بذاتِ خود سی آئی اے کا ہی ہاتھ تھا۔ جیسا کے اَسّی کی دھائی کے شروع میں بیروت میں اغوا ہونے والا TWA کا مسافر طیارہ۔ اسی طرح امریکہ نے سعودی عرب میں موجود الخبر نامی اڈے پر ہونے والے دھماکے کا بھی بھر پور فائدہ اٹھایا، جو امریکہ کے زیرِ استعمال تھا۔ 1996 میں پیرس میں ہونے والی جی۔ سیون کانفرنس کے دوران امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے متعلق چالیس تجاویز پیش کیں۔ نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں دھماکے کرنے والوں اور اوکلاہوما میں ایف بی آئی کی عمارت میں دھماکے کرنے والوں کی اصل شناخت جاننے سے پہلے ہی امریکہ نے اس واقعہ کو 1997 میں دہشت گردی کے خلاف تیار کیے جانے والے قوانین کو سینٹ سے منظور کروانے کے لیے استعمال کیا۔

جی سیون کی تجاویز اور دہشت گردی کے خلاف پاس کروائے گئے نئے قوانین نے امریکہ کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ دنیا بھر میں مُبینہ دہشت گردوں کا پیچھا کر سکے۔ امریکہ کا خیال ہے کہ وہ کسی بھی ایسے شخص کو گرفتار یا اغوا کر سکتا ہے جسے وہ دہشت گردی میں ملوث سمجھتا ہے اور وہ اس پر اپنی مرضی کی سزا نافذ کر سکتا ہے، جیسا کہ قید، جلاوطنی، قومی اور رہائشی حقوق کی نفی وغیرہ۔ یہ

سب کچھ ملزم کو اپنے دفاع کا حق دیے بغیر اور اسے کسی قسم کی عوامی عدالت میں پیش کیے بغیر بھی کیا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ امریکہ ہمیشہ سے ہی شمالی کوریا، چین، عراق، لیبیا اور ان جیسے دوسرے ممالک جو اس کے مفادات کی مخالفت کرتے ہیں، کو عمومی طور پر دہشت گرد ممالک قرار دیتا آیا ہے۔ اس نے بہت سی اسلامی تحریکوں پر دہشت گردی کا الزام عائد کیا ہے۔ جن میں مصر کی اسلامی جہاد، حماس، جماعہ اسلامیہ اور الجیریا کی ایف آئی ایس بھی شامل ہیں۔ اسی طرح اُس نے فلسطین میں یہودیوں کے خلاف ہونے والے دھماکوں اور الجیریا میں فوج کی طرف سے پارلیمانی انتخابات کو کالعدم قرار دینے کے واقعہ کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان قوانین، قراردادوں اور تجاویز کے مطابق امریکہ کسی بھی ایسے شخص، تنظیم، جماعت یا ملک پر نظر رکھ سکتا ہے یا اس پر حملہ کر سکتا ہے جیسے وہ دہشت گرد سمجھتا ہو اور یہ کرنے کے لیے یا تو وہ اپنی فوجی طاقت کا استعمال کر سکتا ہے اور یا پھر اپنے سیاسی اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے کسی پر بھی اقتصادی پابندیاں عائد کر سکتا ہے۔ جیسا کہ عراق اور لیبیا کے خلاف کیا گیا۔ اس رائے کا اظہار امریکہ کے سابق سیکرٹری آف سٹیٹ جارج شلز نے کیا، اس نے مزید کہا کہ "دہشت گرد خواہ جتنا بھی بچنے کی کوشش کر لیں لیکن وہ کبھی بھی چھپ نہیں پائیں گے"۔

چنانچہ امریکہ دہشت گردی کے خلاف اپنائے گے ان قوانین کو **سٹریٹیجک** ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے جس کے ذریعے وہ پوری دنیا پر اپنی گرفت مضبوط کر سکے، خاص طور پر اُن ممالک پر جو امریکی پالیسوں کے خلاف بغاوت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کیمونزم کے خاتمے کے بعد امریکہ نے اسلام کو اپنے سب سے بڑے دشمن کے طور پر شناخت کیا اور اس لیے وہ اب اسلامی ممالک کو **سٹریٹیجک** علاقوں کے طور پر دیکھتا ہے جہاں وہ دہشت گردی کے خلاف قوانین کی مدد سے اپنا اثر ورسوخ بڑھانا چاہتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمان اب نشاۃِ ثانیہ کے راستے پر چل پڑے ہیں اور امریکہ اور دوسرے ممالک یہ بخوبی جانتے

ہیں کہ یہ اسلامی ریاست وہ واحد ریاست ہے جس کے پاس سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کوختم کرنے کی صلاحیت موجود ہے، جس کا سرغنہ اس وقت امریکہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایسی کوئی اسلامی تحریک نظر نہیں آئے گی جس پر امریکہ نے دہشت گردی کا لیبل نہ لگایا ہو۔ یہاں تک کہ ایسی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں بھی اس لیبل سے بچ نہیں پائیں جو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے عسکری ذریعے کا استعمال نہیں کرتیں۔ چنانچہ امریکہ اسلام کی واپسی کا مطالبہ کرنے والے کسی بھی ملک، تحریک یا جماعت کی سرگرمی کو دہشت گردی اور عالمی قوانین کی خلاف ورزی قرار دیتا ہے۔ اس بہانے کو استعمال کرتے ہوئے اور ان ممالک پر دباؤ ڈال کر جنہوں نے دہشت گردی کے خلاف بنائے گئے قوانین کو اپنایا ہے، امریکہ ان ممالک کی قوت کو اپنی سربراہی میں ایسی تحریکوں، جماعتوں اور ریاستوں کے خلاف متحرک کرنے میں کامیاب ہے۔

چنانچہ یہ ان مسلمانوں پر لازمی ہو چکا ہے جو خلافت کے دوبارہ قیام کی جدوجہد کر رہے ہیں اور جو دہشت گردی کی نام نہاد پالیسی کا براہِ راست نشانہ بھی ہیں، کہ وہ دہشت گردی کے خلاف ان قوانین کی اصل حقیقت کو مسلمانوں اور باقی دنیا پر واضح کریں۔ اِنہیں اُس امریکی پالیسی کی اصل حقیقت بھی سامنے لانا ہوگی جس کے تحت امریکہ ان قوانین کے ذریعے پوری دنیا پر حاوی ہونا چاہتا ہے اور یہ حقیقت بھی واضح کرنا ہوگی کہ امریکہ ہی دنیا بھر میں ہونے والے ایسے بہت سارے بم دھماکوں کا اصل ذمہ دار ہے، جن کا الزام مختلف مسلم افراد، جماعتوں یا ریاستوں کے سر تھوپا گیا۔

مسلمانوں پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی اعمال اور طرزِ عمل میں پوری طرح اسلام کو اختیار کریں۔ اسلام میں اپنے ارادے اور مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ایک خاص طریقہ موجود ہے۔ یہ طریقہ خلافت کے دوبارہ قیام کے ذریعے اسلامی طرزِ زندگی کے ازسرِ نو آغاز کی دعوت دینا ہے۔ اس طریقۂ کار پر چلنے کی وجہ خوف یا دہشت گردی کے لیبل سے بچنے کی خواہش

نہیں ہے بلکہ یہ طریقہ جس کا انحصار مادی اور عسکری ذریعے کی بجائے فکری اور سیاسی جدوجہد پر ہے، اسلام کی طرف سے متعین کردہ شرعی طریقہ ہے۔

مسلمانوں کے لیے یہ سمجھنا لازمی ہے کہ اسلامی ریاست یعنی خلافت کے قیام کے بعد اسلامی ریاست کا کام شریعت کی حدود وقیود کے مطابق ہوگا خواہ یہ لوگوں کے اموال کی دیکھ بھال اور حدود کے نفاذ جیسے اندرونی معاملات ہوں یا پھر جہاد کے ذریعے اسلام کو پوری انسانیت تک پہنچانے اور اسلام کے راستے میں حائل مادی رکاوٹوں کو دور کرنے جیسے بیرونی معاملات ہوں۔

مسلمانوں کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اُن کا اپنے اوپر اور دوسروں پر اسلام کا مکمل نفاذ محض چند مسلمانوں کی ذاتی خواہش نہیں ہے اور نہ ہی اس کا مقصد کچھ خاص مفادات کا حصول ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے عین مطابق ہے جس نے انسان، زندگی اور کائنات کو تخلیق کیا اور انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی اسلام کے قوانین کے مطابق ڈھالے جو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ کے ذریعے انسانوں تک پہنچائے ہیں۔

چنانچہ امریکہ اور دوسرے ممالک کا اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گرد کے طور پر پیش کرنا ایک متعصب عمل ہے۔ یہ حقیقت کے بالکل برعکس ہے اور اس کی نفی کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ اسلام سے چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِيْنَ﴾

''اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا'' (الانبیاء: 107)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرَى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾

''اور ہم نے آپ پر قرآن کو نازل کیا جو تمام دین کی باتوں کو بیان کرنے والا ہے اور مسلمانوں کے

لیے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور خوشخبری سنانے والا ہے‘‘ (النحل: 89)

یہ رحمت اسلام کے قوانین کے نفاذ سے صاف ظاہر ہے۔ نماز اور جہاد کے درمیان یا دعا کرنے اور اور اپنے دشمن کو خوف زدہ کرنے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ دینے اور چور کا ہاتھ کاٹنے میں کوئی فرق نہیں اور نہ ہی دکھ میں مبتلا لوگوں کی مدد کرنے یا کے مقدسات پر حملہ کرنے والوں کو قتل کرنے میں کوئی فرق ہے، یہ سب شرعی قوانین ہیں جنہیں اسلامی ریاست عملی طور پر نافذ کرے گی۔

3) بین المذاہب مکالمہ

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دیں۔ مسلمان چودہ صدیوں سے ایسا کرتے آرہے ہیں اور دوسروں کو اسلام کی طرف بلانے کا یہ عمل آج بھی جاری ہے خواہ وہ لوگ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا دیگر غیر مسلم۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَدۡعُ اِلَى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ﴾

’’آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے بلائیں اور ان سے اچھے طریقے سے بحث کیجئے‘‘ (النحل: 125)

رسول اللہ ﷺ نے روم کے بادشاہ ہرکولیس کے نام خط میں لکھا:

((...فانی ادعوك بدعاية الاسلام، أسلِم تَسۡلَمۡ يوۡتكَ الله أجرك مرتين، فان توليت فعليك اثم الاريسيين...))

”میں تمہیں اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم نے اسلام کو اپنایا تو تم محفوظ رہو گے اور اللہ تمہیں دُگنا ثواب دے گا۔ اور اگر تم نے اپنا منہ موڑ لیا تو اُن لوگوں کے گناہ کا بوجھ بھی تم پر ہوگا جو تمہاری حاکمیت تلے رہتے ہیں“۔

چنانچہ غیر مسلموں کو اسلام کی جانب بلانا اُنہیں اسلام پر ایمان لانے اور کفر کو چھوڑنے کی دعوت دینا ہے۔

جہاں تک بین المذہبی مکالمے کی بات ہے جسے آج کل بہت فروغ دیا جا رہا ہے، تو یہ ایک بالکل اجنبی اور شر انگیز مغربی فکر ہے، جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اس مکالمے کا مقصد مختلف مذاہب کے مابین باہمی تعلقات کو فروغ دینا ہے۔ اور اس مکالمے کا مقصد ایک نئے مصنوعی مذہب کا قیام ہے نیز کفار چاہتے ہیں مسلمان اسلام کی بجائے اس نئے مذہب کو اپنا لیں کیونکہ اس فکر کو ماننے والے اور اسے پھیلانے والے خود کفار ہی ہیں۔

اس خیال کا آغاز عالمی طور پر 1932 میں ہوا، جب فرانس نے اپنے چند نمائندوں کو الاظہر یونیورسٹی کے علماء سے اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے ملاپ کے خیال پر گفتگو کرنے کے لیے بھیجا۔ اس کے بعد 1933 میں پیرس کانفرنس منعقد کی گئی جس میں فرانس، برطانیہ، سوئزرلینڈ، امریکہ، اٹلی، پولینڈ، سپین، ترکی اور چند دوسرے ممالک کی تمام یونیورسٹیوں سے مشنریوں اور مستشرقین نے شرکت کی۔ 1936 کی ”دنیا کے مذاہب کی کانفرنس“ دوسری جنگِ عظیم سے قبل مذاہب پر ہونے والی آخری کانفرنس تھی، جس کے بعد جنگ کی وجہ سے یورپی ممالک کا دھیان اِن کانفرنسوں سے ہٹ گیا۔

1964 میں پوپ پاؤلو ششم Pope Paolo VI نے ایک خط بھیجا جس میں اس نے مذاہب کے مابین مکالموں پر زور دیا۔ اس کے بعد 1969 میں ویٹیکن Vatican نے ”مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین مکالمے کے لیے رہنما اصول“ کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔

ستر اور اَسّی کی دہائیوں کے دوران تیرہ سے زائد مرتبہ بین المذہبی اور بین الثقافتی مکالمے کے لیے ملاقاتیں اور کانفرنس ہوئیں، جن میں سب سے مشہور بیلجئم میں ہونے والی ''مذہب اور امن کی دوسری عالمی کانفرنس'' تھی، جس میں دنیا کے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے چار سو افراد نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ سپین کے شہر قرطبہ میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی، جس میں 23 مما لک کے مسلمان اور عیسائی نمائندوں نے شرکت کی۔ یہ دونوں کانفرنسیں 1974 میں منعقد کی گئیں۔ جس کے بعد 1979 میں تیونس کے شہر کرتج میں ''عیسائی مسلمان اسمبلی'' کا انعقاد ہوا۔

نوّے کی دہائی سے بین المذہبی مکالمے پر زور دینے والے افراد پہلے کے مقابلے میں زیادہ سرگرم ہوگئے۔ انہوں نے 1993 میں اُردن میں ''عرب-یورپی کانفرنس'' منعقد کی، جس کے بعد 1994 میں بین المذہبی مکالمے کے لیے خرطوم کانفرنس منعقد کی گئی۔ 1995 میں دو کانفرنسیں ہوئیں، جن میں سے ایک سٹاک ہوم اور دوسری عمّان میں ہوئی، اور اِن دونوں کے بعد 1996 میں ''اسلام اور یورپ'' کے عنوان سے اردن کی اہل البیت یونیورسٹی میں ایک کانفرنس ہوئی۔

مکالمے کے لیے پیش کی جانے والی توجیہات:

بین المذہبی کانفرنس میں موجود نمائندوں کی طرف سے ان کانفرنسوں کے انعقاد کے لیے پیش کیا جانے والا سب سے اہم جواز یہ تھا کہ سوویت یونین جس کفر اور لادینی کی نمائندگی کرتا ہے اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑے رہنا ضروری ہے۔ کیمونزم کو الہامی مذاہب کے لیے خطرے کے طور پر پیش کیا گیا جو کہ ان مذاہب کی ثقافتی کامیابیوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس کے بعد یہ نمائندے پوری انسانیت کی ہمدردی اور پوری دنیا میں مذہبی اعتقاد رکھنے والے لوگوں کا دفاع کرنے کا ڈرامہ رچاتے رہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ کوئی بھی ایک فرد یا مذہب حق اور سچائی کا واحد ٹھیکیدار ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا بلکہ حق کا تعین کرنے کے لیے جمہوری عمل کو بروئے

کارلایا جائے کیونکہ اکثریتی رائے حق کے قریب ترین ہوتی ہے۔ اس طرح انہوں نے سچائی کے مطلب کو نسبتی پیمانوں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی۔

کانفرنسوں میں شرکت کرنے والوں کی تجاویز:

بین المذہبی اور بین الثقافتی مکالموں کے نام پر اسلام اور یورپ کے مابین ہونے والی کانفرنسوں میں جو تجاویز پیش کی گئیں اُن میں سے چیدہ چیدہ تجاویز مندرجہ ذیل ہیں:

1) کفر، دہریت، شرک، ایمان، اسلام، اعتدال، انتہا پسندی اور بنیاد پرستی جیسے الفاظ کے نئے معنی ترتیب دیے جائیں اور ان معانی کو اختیار کیا جائے، تا کہ یہ یقینی بنایا جا سکے کہ یہ الفاظ مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان تفریق کا باعث نہ بنیں۔

2) تینوں مذاہب (یعنی اسلام، عیسائیت اور یہودیت) کے عقیدہ، اخلاقیات اور ثقافت میں مشترکہ عناصر کی نشاندہی کی جائے اور ان مذاہب اور ثقافتوں کے درمیان مثبت تعاون پر خاص زور دیا جائے، کیونکہ تمام اہلِ کتاب ایمان والے ہیں اور وہ سب اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

3) انسانی حقوق پر مشترکہ دستاویز تیار کی جائے تا کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کے مابین امن اور ہم آہنگی پیدا ہو۔ ایسا ممکن بنانے کے لیے اس احساس کو مٹانا ہوگا کہ مختلف مذاہب کے درمیان خون کی دیوار حائل ہے اور مختلف لوگوں کی اپنی الگ الگ ثقافتوں اور مختلف ممالک کی اپنی جدا جدا پالیسیوں کے تصور کو ختم کرنا ہوگا۔

4) تاریخ اور تعلیم کے نصابوں پر نظر ثانی کی جائے تا کہ انہیں نفرت اور اشتعال انگیز مواد سے پاک کیا جا سکے۔ مذہبی تعلیم کو بنیادی انسانی تعلیم کا حصّہ سمجھا جائے گا جن کا مقصد ایسی شخصیتیں پیدا کرنا ہوگا جو مختلف ثقافتوں کو اپنا سکیں اور دوسرے لوگوں کو بخوبی سمجھ سکیں۔ چنانچہ مطالعے کو مخصوص اعتقاد اور عبادات تک محدود کرنے کے عمل کو رد کرنا ہوگا۔

5) عدل، امن، عورتوں کے حقوق، انسانی حقوق، جمہوریت، تکثیریت (pluralism)، کام

کاج کے اخلاقی ضابطوں، آزادی، عالمی امن، پرامن بقائے باہمی، مختلف ثقافتوں کی طرف کھلی ذہنیت رکھنا اور سِول سوسائٹی جیسے تصورات کے مطالعے کو فروغ دیا جائے اور ان کے متعلق مشترکہ آراء قائم کی جائیں۔

بین المذاہب مکالمے کے لیے اختیار کیے جانے والے اسالیب اور طریقہ ہائے کار:

مغربی کفار نے مشنریوں، مستشرقین، ثقافتی کاموں، میڈیا، فکری اور سیاسی دھوکہ دہی کے ذریعے مسلمانوں کو ان کے عقیدہ سے دور کرنے کی کوشش کی، لیکن اس میں ناکامی کے بعد انہوں نے اپنا رخ اپنے ممالک کی حکومتوں اور اپنے ایجنٹوں کے ممالک کی طرف کیا اور مختلف کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کیں، چنانچہ مشترکہ ٹیمیں تشکیل دیں اور مسلم ممالک میں سینٹر آف سٹڈی قائم کیے، انہوں نے جان بوجھ کر ایسی اصطلاحات اور عموی الفاظ کا استعمال کیا جن کے معانی میں ابہام پایا جاتا تھا، تاکہ ایک فریب اور مغالطے کی فضا قائم جا سکے۔ تجدید، دنیا کو کھلی ذہنیت سے دیکھنا، انسانی تہذیب، عالمی سائنسی نظریات، پرامن بقائے باہمی کی ضرورت، بے جا طرفداری اور انتہا پسندی کو ترک کرنا، عالمگیریت (گلوبلائزیشن) وغیرہ، ان اصطلاحات کی چند مثالیں ہیں۔

کفار نے سائنس اور ثقافت کے تصورات کو باہم خلط ملط کر دیا اور اسی طرح تہذیب اور تمدن کے تصورات کو بھی غلط طریقے سے پیش کیا تاکہ وہ ایسے لوگوں پر حملے کا جواز بنا سکے جو اپنے مخصوص طرزِ زندگی پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ایسے لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی اور ان سے جنم لینے والی تہذیب کے مخالف ہیں اور الزام لگایا کہ یہ لوگ لکیر کے فقیر اور دقیانوسی خیالات کے حامل ہیں، حالانکہ اسلام میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسلام ہمیشہ سائنس اور اس سے حاصل ہونے والی ٹیکنالوجی کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھتا ہے، لیکن کسی ایسی ثقافت کو یا کسی ایسے تمدن کو جو اسلامی ثقافت یا تہذیب سے نہیں نکلتی، قبول نہیں کرتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان افکار و تصورات کا تعلق انسان کے طرزِ عمل سے ہے، جسے زندگی کے متعلق اسلامی اصولوں کے

ذریعے نظم وضبط میں لانا ضروری ہے۔

انہوں نے چند سرمایہ دارانہ تصّورات کو بڑھا چڑھا کر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ تصورات اسلام کی نفی نہیں کرتے بلکہ یہاں تک کہ چند مسلمان انہیں اسلام کا حصہ سمجھتے ہیں، جیسا کہ جمہوریت، آزادی، تکثیریت (Pluralism)، سوشلزم وغیرہ۔ دوسری طرف انہوں نے جہاد، حدود، ایک سے زیادہ شادیاں کرنا اور دیگر اسلامی احکامات کو غیر مہذب اور پرانا قرار دیتے ہوئے رد کر دیا۔

انہوں نے سرمایہ دارانہ فکر کو معیار بناتے ہوئے اسلام کا مطالعہ کیا، جو کہ کسی امر کے متعلق حکم معلوم کرنے کے لیے حقیقت ہی کو بنیاد بنالیتی ہے اور حقیقت کو فکر کے لیے موضوع کی حیثیت تک محدود نہیں رکھتی۔ یہ کسی بھی حکم کو اپنانے یا ترک کرنے کا پیمانہ حلال اور حرام کی بجائے ذاتی مفاد کو بناتی ہے۔ اس عمل نے چند مسلمانوں کو کچھ ایسے نئے فقہی اصول ایجاد کرنے پر مائل کیا، جو کہ اسلام کو سمجھنے کے لیے شریعت پر انحصار نہیں کرتے تھے۔ ان اصولوں میں حقیقت پر مبنی فقہ، متوازن فقہ، ضرورت کی صورت میں حرام چیزوں کا حلال ہو جانا وغیرہ شامل ہیں۔ نتیجتاً اسلامی احکامات میں ملاوٹ ہوگئی اور اصل احکامات اور انسانوں کے بنائے ہوئے باہر سے درآمد شدہ احکامات کے مابین، بلکہ یہاں تک کہ اسلام کے دائرے اور کفر کے دائرے کے مابین فرق بہت تھوڑا رہ گیا۔ مثال کے طور پر ان لوگوں کی طرف سے سود کو تسلیم کیا جا چکا ہے اور حربی کفار کے خلاف شہادتی کاروائی کو خودکشی کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔

جن کفار نے اس مکالمے کا آغاز کیا تھا وہ اب اس کا دائرہ مزید وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ اب یہ محض ان چند لوگوں تک محدود نہیں رہے گا جو چند کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کرتے ہیں۔ بلکہ اس مکالمے میں معاشرے میں موجود ہر قسم کے لوگوں کو شریک کیا جائے گا، خواہ وہ مرد ہوں، عورتیں ہوں، پڑھے لکھے لوگ ہوں یا محنت کش لوگ۔ یہ سب کچھ یونیورسٹیوں، تعلیمی اداروں، مختلف جماعتوں اور انجمنوں کے ذریعے کیا جائے گا، جیسا کہ کانفرنس کے کچھ شرکاء نے

بیان کیا۔ اس سب کا مقصد یہ ہے کہ لوگ معاشی نظام، معاشرتی تعلقات، سیاست اور تعلیم وغیرہ میں مغربی تہذیب کو شامل کریں۔ چنانچہ سرمایہ دانہ نظام کے علَم برادروں کے بقول سرمایہ دارانہ نظام (یعنی کیپیٹل ازم) انسانیت، عقل پسندی، آزادی اور جمہوریت کا نام ہے۔ ان کے مطابق یہ آج کی نئی اور کامیاب تہذیب ہے اور اسلام کو اندھے اعتقاد، وراثتی چیز اور جبر کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور اسلام کو دین کے تسلط، ایک سے زیادہ شادیوں اور غلامی جیسے تصورات کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ گویا اسلام ایک غیر مہذب مذہب ہے!

ان کانفرنسوں کے اصل مقصد کو مسلمانوں سے چھپانے کے لیے ایک اسلوب کے طور پر عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں، بدھ مت کے پیر کاروں اور سکھوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ جاپان میں ہونے والی ''عالمی کانفرنس برائے مذہب اور امن'' میں اور 1970 میں بیروت میں ہونے والے ایک سیمینار میں بھی ایسا ہی کیا گیا تاکہ مسلمانوں کو ہرگز محسوس نہ ہو کہ اس مکالمے کا اصل ہدف مسلمان ہیں۔ یہ نام نہاد مسلمان علماء اسلام کو بدھ مت اور دیگر مذاہب کی صف میں کیسے کھڑا کر سکتے ہیں؟

مغرب کا اسلام کے متعلق اصل نظریہ:

مسلمانوں کے ساتھ مکالموں پر زور دینے والا اور مکالموں کے لیے کانفرنسیں منعقد کرنے والا مغرب اصل میں اسلام کو دشمن کے طور پر دیکھتا ہے۔ یہی نقطۂ نظر ان بین المذہبی مکالموں کا سبب ہے اور یہی اس مکالمے کو ایک سمت دیتا ہے۔ مثال کے طور پر فرانسیسی کلچر کے انسائیکلو پیڈیا میں جو کہ ایک مشہور مطالعاتی کتاب ہے، لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک قاتل اور عیسیٰ علیہ سلام کے دشمن تھے، وہ عورتوں کو اغوا کرتے تھے اور انسانی سوچ کے بہت بڑے دشمن تھے''۔

اسی طرح مغربی یورپ کی اکثر نصابی کتابوں میں محمد ﷺ، اسلام اور مسلمانوں کو بہت ہی بھیانک طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہی امریکی مفکر فوکویاما کی کتاب ''دِی اینڈ آف ہسٹری'' میں یہ بیان کیا گیا: ''سرمایہ دارانہ نظام انسان کے لیے دنیا میں لافانی

نجات کا سبب ہے۔ اسلام اپنی تمام تر کمزوریوں اور شکست و ریخت کے باوجود اس نئے اور کامیاب طرز زندگی کے لیے خطرہ ہے''۔ نیٹو کے سابق جنرل سیکرٹری ہاوئیر سولانہ نے کہا: ''بنیاد پرست اسلام مستقبل کی عالمی سیاست کے لیے ایک خطرہ ہے''۔ مستشرِق برنارڈ لیوس نے اسلام اور سرمایہ دارانہ نظام کے متعلق کہا: ''یہ ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ان کے مابین مکالمے کا کوئی مستقبل نہیں''۔ ہارورڑ یونیورسٹی کے پولیٹیکل سائنس کے پروفیسراور انسٹی ٹیوٹ آف سٹریٹیجک سٹڈیز کے ڈائریکٹر سیموئل ہنٹنگٹن نے بیان کیا کہ: ''خارجہ پالیسی پر مستقبل میں تہذیبوں کے مابین جنگ کا غلبہ رہے گا۔ ان تہذیبوں کو تقسیم کرنے والی یہ لکیریں ہی مستقبل میں جنگ کی لکیریں ہوں گی۔'' اس کے بعد اس نے کہا: ''مذہب خود کو بالکل الگ رکھتا ہے اور یہ بات لوگوں پر واضح ہے۔ ایک شخص آدھا فرانسیسی اور آدھا عرب تو ہوسکتا ہے... لیکن کسی شخص کے لیے آدھا کیتھولک عیسائی اور آدھا مسلمان ہونا نہایت مشکل ہے...''

اگر ہم ان بیانات اور مسلمانوں کے خلاف ان کے جارحانہ اقدامات کو ملا کر دیکھیں، جیسا کہ صلیبی جنگیں، سپین سے مسلمانوں کا صفایا، خلافت کا خاتمہ اور اس کے بعد فلسطین میں یہودی ریاست کا قیام اور اسلامی تحریکوں کو دہشت گرد اور انتہا پسند کے طور پر پیش کرنا وغیرہ، تو ہمیں اس مکالمے کا اصل مطلب اور مقصد بخوبی سمجھ آجائے گا، جو کافر مغرب مسلمانوں کے ساتھ کر رہا ہے۔

مکالمے کے مقاصد:

مغرب کے لیے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے مابین اس مکالمے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ روزمرہ زندگی میں اسلام کی ایک مکمل نظام کے طور پر واپسی کو روکا جا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ان کی آئیڈیالوجی اور بقا کے لیے خطرہ ہے اور ان کے مفادات اور اثر ورسوخ کو ختم کر دے گا۔

جہاں تک جزوی مقاصد کا تعلق ہے جو کہ اس بنیادی مقصد کو ہی پورا کرتے ہیں، تو یہ

متعدد ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ پوری دنیا اور خصوصاً مسلم علاقوں کو سرمایہ دارانہ تہذیب کے رنگ میں ڈھالنا چاہتے ہیں، تاکہ اس تہذیب کو اسلامی تہذیب سے بدل دیا جائے اور یہ تہذیب اسلامی تہذیب کی جگہ لے لے۔ اس طرح سے ان کے لیے لوگوں کے دل و دماغ سے اسلامی ثقافت کو مٹانا آسان ہو جائے گا۔ ایسا کرنے کے لیے وہ اسلامی ثقافت، اس کے منبع اور اس کے اصولوں پر سے لوگوں کا اعتماد متزلزل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ تہذیبوں کے اس ٹکراؤ میں اسلام کو شکست دینے کے لیے اسے اس کے سب سے ضروری اور باقی مذاہب سے الگ کرنے والے پہلو سے محروم کرنا چاہتے ہیں، یعنی اسلام کا سیاسی پہلو، جس کے تحت اسلام کے احکامات کے مطابق امّت کے امور کی دیکھ بھال اور اسلام کو پوری دنیا تک پہنچانے کے لیے خلافت کو قائم کیا جائے گا۔

سرمایہ دار مسلمانوں کی شخصیتوں کو اس طرح سے تبدیل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ فرائض کو چھوڑنے اور حرام عمل کرنے میں کوئی شرم محسوس نہ کریں۔ پھر وہ مسلمانوں کی اسلامی خواہشات اور اقدار میں ملاوٹ کر دیں اور ان کے دلوں سے اسلام کے جذبات کو مٹا دیں۔ تاکہ وہ کفر اور کفار سے نفرت چھوڑ دیں اور خیر کی دعوت دینا اور منکرات سے روکنا بند کر دیں۔ یوں وہ مسلم امت کے اس حصار کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں جو اسلامی ثقافت کے نتیجے میں قائم ہوا اور جس کے ذریعے امت نے تمام بیرونی فکری خطرات کا مقابلہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ وہ جذباتی اور فکری حصار بھی ختم ہو جائے گا، جو مسلم سرزمین پر سرمایہ دارانہ تہذیب کے وجود کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ چنانچہ کفار کے لیے اپنے مفادات اور اثر و رسوخ کا تحفظ بہت آسان ہو جائے گا۔ اور وہ اپنے وجود اور بقاء کو یقینی بنا سکیں گے۔

یہ بین المذاہب مکالمہ، جس کی کفار اور ان کے ایجنٹ حکمران، مسلمان ممالک میں موجود علماء اور مفکرین کے ایک بڑے ٹولے کے ذریعے حفاظت کرتے ہیں، کے پسِ پردہ اصل سوچ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک نیا مذہب ترتیب دیا جائے۔ یہ مذہب ''دین کی دنیاوی امور سے جدائی'' کے عقیدے پر مبنی ہے، جس کے تحت خالق کی بجائے انسان کو قانون سازی کا حق حاصل ہے۔ ان لوگوں کی اصلیت ویسی ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہے:

﴿وَلَايَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوا﴾

''اور یہ کفار ہمیشہ تمہارے ساتھ لڑتے رہیں گے، یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین (اسلام) سے پھیر دیں'' (البقرة: 217)

اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَاالنَّصَارٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾

''اور کبھی خوش نہ ہوں گے یہود اور نصاریٰ جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیروکار نہ ہو جائیں'' (البقرة: 120)

چونکہ اسلامی تہذیب کی بنیاد اسلام کا عقیدہ ہے اور مغربی تہذیب کی بنیاد سرمایہ دارانہ عقیدہ ہے اس لیے ان دونوں کو ملانا ناممکن ہے۔ چنانچہ مغرب کی رہنمائی میں ہونے والے اس بین المذہبی مکالمے کے پسِ پردہ نیت یہ ہے کہ مسلمان سرمایہ دارانہ تصورات کے حق میں اسلامی تصورات سے دستبردار ہو جائیں۔ ایسا اس لیے ہے کیونکہ کفار اچھی طرح جانتے ہیں کہ دو متضاد عقائد کا یکجا ہونا ناممکن ہے۔

چنانچہ مشترک پہلو ڈھونڈنے اور ایک نئی انسانی تہذیب قائم کرنے کے لیے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے مابین ہونے والا یہ مکالمہ غیر حقیقی ہے۔ سچ اور جھوٹ، بدصورتی اور خوبصورتی اور حق اور باطل کے درمیان فرق جاننے کے لیے ان مذاہب اور تہذیبوں کے مابین ایک فکری جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ﴾

''سو جو میل کچیل ہے وہ ناکارہ ہو کر جاتا رہتا ہے، لیکن جو لوگوں کے لیے نفع بخش ہوتا ہے وہ زمین پر باقی رہتا ہے'' (الرعد: 17)

جس مکالمے کی وہ دعوت دیتے ہیں، اس مکالمے کے سرپرست اسلام دشمن عناصر

ہیں، جن کا مقصد اسلام، اسلامی تہذیب اور اُمتِ مسلمہ کی تباہی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو مقابلے کے لیے تمام ضروری اسلوب و وسائل اور بہترین طریقے سے اپنانے ہوں گے، جو خلافت کے قیام سے ہی ظاہر ہوں گے۔ اور خلافت برتر اسلامی تہذیب کے پھیلاؤ اور باقی تمام جھوٹی اور کرپٹ تہذیبوں کے خاتمے کے لیے ایک فکری اور مادی جدوجہد کرے گی۔

ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کا بہانہ:

یہ نقطۂ نظر تینوں آسمانی مذاہب کے مابین مکالمے کو تقویت فراہم کرنے کے لیے پیش کیا گیا۔ کیونکہ ان تینوں مذاہب کو لانے والے یعنی محمد ﷺ، عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کے آباؤ اجداد ابراہیمؑ ہی تھے۔ لہٰذا تینوں مذاہب کے ماننے والوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ پر امن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں کیونکہ نسل اور مذہب کے لحاظ سے ان کا ماخذ ایک ہی ہے۔

یہ تو ایک زاویہ ہے۔ دوسرے زاویے سے یہ نقطۂ نظر مشرق وسطیٰ میں نام نہاد امن منصوبے اور یہودیوں کے ساتھ تعلقات کی بحالی کو تقویت دیتا ہے۔ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہودیوں اور مغرب کی ایک سازش کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے، کہ جس کے تحت انہوں نے مسجد الاقصیٰ اور فلسطین پر اسرائیل کے قیام کے ذریعے قبضہ کیا اور امتِ مسلمہ کے قلب میں زہریلا خنجر گھونپ دیا۔ یہ یروشلم (القدس)، جس میں مقاماتِ مقدسہ واقع ہیں، پر یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے مشترکہ کنٹرول کا جواز فراہم کرنے کے لیے ہے۔ کیونکہ ان تینوں کا تعلق انبیاء کے جدِ امجد ابراہیمؑ کے مذہب سے ہے۔

اس نقطۂ نظر کے بودے پن کو ظاہر کرنے اور اس کے رد کے لیے ہم تین اُمور کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں:

1) لغوی معاملہ:

لفظ اَسۡلَمَ کے لُغوی معنی ہیں اِنۡقَادَ (یعنی سرِ تسلیم خم کرنا)۔ قرآن مجید نے انبیاء اور ان کے صحابہ کے واقعات کو بیان کرنے کے لیے، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کے سامنے اپنا سر جھکایا، اس لفظ کو اسی مطلب کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا، کہ انہوں نے کہا:

﴿اِنۡ أَجۡرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ﴾

''میرا معاوضہ تو صرف اللہ ہی کے ذمے ہے اور چونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت کرنے والوں میں سے رہوں'' (یونس: 72)

اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا یہ قول بیان کیا:

﴿رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وِمَنۡ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَكَ﴾

''اے ہمارے رب! ہمیں اپنا اطاعت گزار بنا لیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی اطاعت گزار ہو'' (البقرة: 128)

اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿فَمَا وَجَدۡنَا فِيهَا غَيۡرَ بَيۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ﴾

''ہم نے مسلمانوں کے ایک گھر کے سوا اور کوئی گھر اطاعت گزاروں (مسلمانوں) کا نہیں پایا'' (ذاریات: 36)

اور حضرت موسیٰؑ کی زبان سے یہ کہلوایا:

﴿فعَلَيۡهِ تَوَكَّلُوا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُسۡلِمِيۡنَ﴾

''تو سوچ میں مت پڑو بلکہ اسی پر توکل کرو اگر تم اس کی اطاعت کرنے والے (مسلمان) ہو'' (یونس:84)

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کے حواریوں (ساتھی) کے متعلق یہ بات بیان کی کہ انہوں نے کہا:

﴿آمَنَّا بِاللّٰهِ وَ اشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾

''ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ اس کے گواہ رہیئے کہ ہم اطاعت گزار (مسلمان) ہیں'' (آل عمرٰن:54)

سو اِن آیتوں میں پائے جانے والے لفظ **مسلمون** کے معنی ہیں: وہ لوگ جنہوں نے اطاعت کی (**منقادون**)۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے ایک دین یعنی رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے اسلام کی پیروی کی، وہ اسلام سے واقف ہی نہ تھے اور نہ ہی انہیں اسلام پیش کیا گیا تھا۔ بلکہ ہر قوم کے لیے ایک خاص پیغمبر تھا، جس نے انہیں ایک خاص شریعت کی دعوت دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا﴾

''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقہ مقرر کیا'' (المائدہ: 48)

جب رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی، تو اس وحی نے عربی کے چند الفاظ کے لغوی معنی تبدیل کر کے انہیں نئے شرعی معنی دیے۔ قرآن اور سنّت کے مطالعے سے یہ بات صاف ظاہر ہے۔ ان الفاظ میں سے ایک لفظ ''اسلام'' ہے، جس کا لغوی معنی ''اطاعت کرنا'' ہے لیکن اب اس کا شرعی معنی ہے ''اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا وہ دین جو اس نے رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا''۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک پوری انسانیت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَرَضِيتُ لَكُمُ الاِسْلَامَ دِينًا﴾

''اور میں نے اسلام کو تمہارے لیے بطورِ دین پسند فرمایا'' (المائدہ : 3)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا:

﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الاِسْلَامِ دِينًا فَلَا يُقْبَلَ مِنْهُ﴾

''اور جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی اتباع کرے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا'' (آل

عمرٰن: 85)

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بُنی الاسلام علی خمس))

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے''

اور اسلام کے علاوہ باقی مذاہب کی بنیاد ان پانچ چیزوں پر نہیں ہے۔

شارع کی طرف سے لفظ ''اسلام'' کو شرعی معنی دے دینے کے بعد اس میں سے اخذ کردہ تمام الفاظ، جیسا کہ **اسلم** اور **مسلم** جیسے فعل اور اسم فاعل، اگر قرینہ کے بغیر استعمال کیے گئے ہوں، تو ان کا صرف شرعی مطلب ہی لیا جا سکتا ہے۔ جہاں بھی لفظ کے لغوی معنی مراد ہوں، تو وہاں قرینہ کی ضرورت ہوگی۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا كَانَ اِبۡرَاهِيۡمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصۡرَانِيًّا وَلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُسۡلِمًا﴾

''ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی، بلکہ وہ سچے مسلمان تھے'' (اٰل عمرٰن: 67)

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابراہیمؑ اس دین پر تھے جو اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ پر نازل کیا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی ابراہیمؑ پر نازل کیا، ابراہیمؑ اس کی اطاعت کرنے والے تھے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے برعکس کہ جنہوں نے اپنے انبیاء کے دین میں ملاوٹ کی۔

جہاں تک محمد ﷺ، عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کا ابراہیمؑ ہی کے دین پر ہونے کا تعلق ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب مبارک ہستیاں ایک ہی عقیدے پر یقین رکھتی ہیں، جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہر دین کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس آیت میں یہی مطلب ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمۡ مِنَ الدِّيۡنِ مَاوَصّٰى بِهٖ نُوحًا وَالَّذِي اَوۡحَيۡنَا اِلَيۡكَ وَمَا وَصَّيۡنَا بِهٖ

﴿ اِبْرَاهِيْمَ وَموسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا لدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيهِ﴾

''اللہ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوحؑ کو حکم دیا تھا اور جسے ہم نے آپ ﷺ کے پاس وحی کے ذریعے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا'' (شوریٰ: 13)

چنانچہ اس آیت میں لفظ ''دین'' کا مطلب ہے دین کی بنیاد جو کہ عقیدہ کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تخصیص کردی، جب اللہ نے فرمایا:

﴿لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وِمِنْهَاجًا﴾

''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک خاص شریعت اور ایک خاص طریقہ مقرر کیا ہے'' (المائدہ: 48)

2) شرعی مسئلہ:

اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو تمام انبیاء اور پیغمبروں کا خاتم یعنی آخری نبی کے طور پر پوری انسانیت کے لیے بھیجا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو اپنے پرانے مذاہب کو چھوڑنے کا حکم دیا، خواہ وہ الہامی ہوں یا غیر الہامی، اور انہیں اسلام کو ایک دین کے طور پر اپنانے کا حکم دیا۔ جس نے بھی اس حکم کی تکمیل کی وہ مسلمان ہو گیا اور جس نے اسے ٹھکرایا اس نے کفر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقُلْ لِلَّذِيْنَ أُوتُوالْكِتَابَ وَالأُمِّيِّينَ ءأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلاغُ وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ﴾

''اور اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب سے کہہ دیجیے کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ سو اگر وہ لوگ اسلام لے آئیں تو وہ لوگ بھی راہِ راست پر آجائیں گے اور اگر وہ لوگ روگردانی کریں تو آپ کے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہے۔ اللہ خود اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے'' (آل عمرٰن: 20)

اور فرمایا:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُوْلٌ مِنَ اللّٰهِ﴾

''جن لوگوں نے کفر کیا یعنی اہلِ کتاب اور مشرکین، وہ اپنے کفر سے ہرگز باز آنے والے نہ تھے، جب تک کہ ان کے پاس واضح دلیل نہ آ گئی یعنی اللہ کا رسول ﷺ'' (بينة: 2-1)

یعنی یہ لوگ تب تک کفر سے علیحدہ نہیں ہو پائیں گے جب تک یہ اسلام قبول نہ کر لیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((والذی نفس محمد بیدہ لا یسمع بی احد من ھذہ الامہ یھودی ولا نصرانی ثم یموت و لم یؤمن بالذی ارسلت بہ الا کان من اصحاب النار))

''قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! اس امت میں سے کوئی بھی ایسا شخص چاہے وہ یہودی ہو یا عیسائی، جو کہ میرے بارے میں سنے لیکن مجھ پر بھیجے گئے پیغام پر یقین کئے بغیر مر جائے، تو وہ شخص اہلِ نار میں سے ہوگا۔''

چنانچہ سب لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اسلام پر ایمان لائیں اور جو شخص بھی اسلام کی حجت ظاہر ہونے کے باوجود بھی اسلام قبول نہ کرے، وہ بلاشبہ کافر ہے۔ محمد ﷺ کی نبوت کے بعد بھی اگر یہودی اور عیسائی اپنے مذہب پر قائم رہیں تو قرآن کے مطابق وہ کافر ہیں۔ انہیں مسلمان کہنا منع ہے اور جو کوئی بھی سمجھتا ہے کہ وہ یا ان جیسے لوگ مسلمان ہیں، تو وہ بھی کافر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایسا عقیدہ رکھ کر اُس نے ایسی شرعی نصوص کی کھلی خلاف ورزی کی ہے، جو معنی اور ثبوت کے لحاظ سے قطعی ہیں۔ اگر وہ اسی ایمان کے ساتھ مر گیا تو وہ اہلِ نار میں سے ہوگا۔

3) مسلمانوں عیسائیوں اور یہودیوں کا ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کا معاملہ:

ایسا کہنا قوم پرستی کی طرف دعوت دینا ہے۔ قومیت کا تعلق ورشتہ جبلتِ بقا سے جنم لیتا ہے۔ اور یہ ایک سطحی اور جذباتی بندھن ہوتا ہے۔ یہ انسان کے لیے مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ کسی

بھی ایسے دو اشخاص کے مابین تعلق قائم نہیں کر سکتا، جن کی نسل مختلف ہو۔

ابراہیمؑ کی نسل کا تعلق وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ آج اس بندھن کا کوئی وجود نہیں ہے۔ کیونکہ ابراہیمؑ کی اولاد شادی بیاہ، معاشرتی تعلقات، ہجرت اور جنگوں کے ذریعے دوسرے لوگوں سے گھل مل چکی ہے۔ آج ان کی نسل اور دوسرے لوگوں کے مابین فرق کرنا ناممکن ہے۔ تینوں مذاہب کے پیروکار دنیا کے تمام لوگوں اور اقوام میں پائے جاتے ہیں۔ پس اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ نسل کی بجائے مذہب کی بنیاد پر اکھٹے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ابراہیمؑ کے اولاد کے متعلق دعوے کو مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں پر یا مسجد الاقصیٰ کے ارد گرد رہنے والوں پر یا کسی بھی دوسرے پر عائد کرنا ایک بے معنی مشق ہے اور غلط ہے۔ اس سب کا مقصد اسلام کے خلاف لڑنا، عرب اسرائیل امن منصوبے کے لیے بہانہ پیش کرنا اور اسرائیل کے یہودیوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات میں بہتری لانا ہے۔ اور یہ سب اس لیے ہے تا کہ مسلم علاقوں کے دغاباز حکمرانوں کی جانب سے کیے گئے بھیانک جرائم کو جائز قرار دیا جا سکے، جو کہ انہوں نے اپنے آقاؤں یعنی مغربی کفار کے حکم پر سرانجام دیے۔

خاندان یا قومیت پر مبنی کوئی بھی بندھن ابراہیمؑ کی نسل کے بندھن جیسا ہی ہے۔ شریعت نے لوگوں کے مابین مستقل تعلقات قائم کرنے کے لیے ایسے ربط و تعلق کو بنیاد کے طور پر اختیار کرنے کو رد کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَأَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوهَاْ وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَاوَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ وَاللّٰهُ لَايَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ﴾

''آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور

تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں تمہیں نقصان کا اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوں تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم یعنی عذاب بھیجے اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا'' (التوبہ: 24)

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا تعلق خاندان، قومیت یا مفاد پر مبنی بندھن پر فوقیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پچھلے پیغمبروں کو نسلی تعلق و رشتے کے سطحی ہونے کے متعلق سمجھایا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا:

﴿وَنَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنْتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ قَالَ يَانُوحُ اِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ اِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾

''اور جب نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا کہ اے میرے رب! میرا یہ بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور آپ کا وعدہ بالکل سچا ہے۔ اور آپ احکم الحاکمین اور بڑی قدرت والے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ نے) ارشاد فرمایا کہ اے نوح! یہ شخص تمہارے گھر والوں میں سے نہیں، اس کے اعمال صالح نہیں'' (ھود: 46-45)

اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ﴾

''اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ میں تمہیں لوگوں کا مقتدا بناؤں گا۔ ابراہیمؑ نے عرض کی اور میری اولاد میں سے بھی۔ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) اللہ کا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں'' (البقرہ: 124)

چنانچہ شرع کے معیار کے مطابق نوحؑ کا بیٹا ان کے خاندان میں سے نہیں ہے کیونکہ وہ ان سب باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا، جو اللہ تعالیٰ نے اس کے باپ نوحؑ پر نازل فرمائی تھیں۔ اسی

طرح سے ابراہیمؑ کی اولادوں میں سے تمام ظالم لوگ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے سے خارج ہیں کہ ابراہیمؑ کی اولادمیں سے لوگوں کو انسانیت کے لیے پیشوا بنایا جائے گا۔ کیونکہ انہوں نے ان باتوں کو تسلیم نہیں کیا جو اللہ نے ان کے باپ ابراہیمؑ پر نازل فرمائی۔

چنانچہ آج ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کے متعلق بات کرنا ایک جاہل بات ہے۔جس کے پیچھے سیاسی مقصد ہیں۔ اس کے متعلق بات کرنا اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دینا حرام ہے۔ کیونکہ آج اس بات کو دہرانے کا مقصد اسلام سے لڑنا ،مسلمانوں کو ان کے دین سے دور کرنا، یہودیوں کے ساتھ دھوکے سے کیئے گئے امن معاہدے کو جائز بنانا اور فلسطین کی پاک سرزمین سے دستبردار ہوجانا ہے،جس پر انہوں نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے،تاکہ ان کے ساتھ تعلقات میں بہتری لائی جا سکے اور اسرائیل کو مشرقِ وسطیٰ میں ایک ریاست کی حیثیت سے تسلیم کیا جا سکے۔

4) سمجھوتہ:

مسلمان جدید دور سے قبل اس اصطلاح سے واقف نہ تھے۔ یہ ایک اجنبی اصطلاح ہے جس کا ماخذ مغرب اور اس کی سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی ہے۔ اس آئیڈیالوجی کا عقیدہ حلِ وسط یعنی سمجھوتے کے حل پر مبنی ہے۔ ایک طرف چرچ اور اس کے ماتحت بادشاہوں اور دوسری طرف نئی نسل کے مغربی دانشوروں اور فلسفہ دانوں کے مابین ہونے والے خونریز لڑائی کے نتیجے میں سمجھوتے پر مبنی اِس حل نے جنم لیا۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ عیسائیت تمام دنیاوی معاملات کو حل کرنے کے قابل ہے جبکہ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ عیسائیت میں یہ قابلیت موجود نہیں ، بلکہ یہ ہماری ذلت اور پستی کا سبب ہے۔ ان کی نظر میں انسانی دماغ ہی وہ واحد شے ہے جو ایک ایسے نظام کو جنم دے سکتی ہے جو دنیاوی معاملات کو منظّم کرنے اور پیدا ہونے والے کسی بھی مسئلے کو حل کرنے کے قابل ہو۔

شدید ٹکراؤ کے بعد دونوں گروہوں نے سمجھوتے پر مبنی ایک حل پر اتفاق کرلیا۔ مذہب کو انسان اور اس کے خالق کے مابین تعلق کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ لیکن اس شرط پر کہ اس کا دنیاوی معاملات میں کوئی عمل دخل نہیں ہوگا اور اِن معاملات کی تنظیم انسان خود کرے گا۔ پھر انہوں نے دین اور دنیا میں جدائی کے اِس تصور کو اپنی آئیڈیالوجی کے عقیدے کے طور پر اپنالیا، جس سے سرمایہ دارانہ نظام نے جنم لیا اور جس کے بل بوتے پر مغربی ممالک نے ترقی کی اور پھر استعماریت کے ذریعے اس آئیڈیالوجی کو پوری دنیا تک پھیلانا شروع کردیا۔

اس سمجھوتے پر مبنی حل کے اثرات، جس پر انہوں نے اپنے عقیدہ کو استوار کیا تھا، قانون سازی کے تمام پہلوؤں اور اس سرمایہ دارانہ آئیدیالوجی کے پیروکاروں کے طرزِ عمل میں صاف طور پر ظاہر ہونے لگے۔ سیاسی معاملات بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ فلسطین کا معاملہ اس کی ایک موزوں مثال ہے۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ فلسطین پر ان کا حق ہے، جبکہ یہودیوں کا کہنا ہے کہ فلسطین وہ مقدّس سرزمین ہے، جس کا اللہ نے اُن سے وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ اس پر صرف یہودیوں کا حق ہے۔ 1947ء میں سرمایہ دارانہ مغرب ممالک نے بٹوارے پر مبنی ایک حل پیش کیا، جس کے مطابق فلسطین کو دو ریاستوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے، ایک ریاست یہودیوں اور دوسری ریاست مسلمانوں کے لیے۔ اس کے بعد بٹوارے کی اس سوچ کو بہت سے ایسے عالمی مسائل کو حل کرنے کے لیے پیش کیا گیا تھا، جن کی اصل وجہ خود سرمایہ دارانہ ممالک ہی تھے، جیسے کہ کشمیر، بوسنیا، قبرص وغیرہ

چنانچہ سرمایہ دارنہ ممالک کی سیاست جھوٹ اور فریب پر مبنی ہے۔ جہاں حق اور پورے سچ پر پہنچنے کی بجائے کوشش یہ کی جاتی ہے کہ کم ازکم کچھ بھی حاصل کرلیا جائے، خواہ وہ حق کے قریب ہو یا نہیں۔ تمام پارٹیاں اپنے مقاصد حاصل نہیں کرسکتیں لہٰذا وہ سمجھوتہ کر کے کسی ایسے حل پر پہنچ جائیں، جو دونوں پارٹیوں کو قابلِ قبول ہو۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہ صحیح حل ہے، بلکہ اپنی طاقتور یا کمزور صورتِ حال کے پیشِ نظر۔ اگر طاقتور کے بس میں ہو تو وہ جو چاہے منوا لیتا ہے، اور کمزور اس تمام سے دستبردار ہوجاتا ہے، جو وہ حاصل نہیں کرسکتا۔

چند مسلمانوں نے سمجھوتے کے اس تصور اور اس پر مبنی حل کو تنقید کا نشانہ بنانے اور اس میں موجود خامیوں اور خرابیوں کو ظاہر کرنے کی بجائے اسے تسلیم کرلیا ہے اور یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ یہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اسلام اسی تصور پر استوار ہے۔ ان کے خیال میں اسلام روحانیت اور مادیت، انفرادیت اور اجتماعیت، حقیقت پسندی اور آئیڈیل ازم، تسلسل اور تبدیلی کے درمیان میں ہے۔ زیادتی یا کمی کو کوئی وجود نہیں اور نہ ہی حد سے تجاوز کرنا یا غفلت برتنا کوئی معانی رکھتا ہے۔

اپنی اختیار کردہ رائے کو ثابت کرنے کے لیے ان مسلمانوں نے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے تک پہنچے کہ ہر چیز میں دو انتہائی حدیں اور ایک درمیانی نقطہ نظر ہوتا ہے۔ درمیانی راستہ محفوظ ہوتا ہے۔ جبکہ دونوں انتہائی راستے خطرے اور فساد کا باعث بن سکتے ہیں۔ یہ درمیانی نقطہ طاقت کا مرکز ہوتا ہے اور دونوں انتہائی نقطوں کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے۔ کسی چیز کے درمیانی نقطے اور سمجھوتے کے تصور دونوں میں ایک ہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان کے خیال میں اس میں کوئی حیرانی والی بات نہیں کہ اسلام کے ہر پہلو میں سمجھوتے کی گنجائش ہونی چاہیے۔ سو ان کے بقول اسلام ایمان اور عبادات، قانون سازی اور اخلاقیات اور اسی طرح باقی چیزوں میں درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے۔

اسلامی احکامات کو عقل کے بل بوتے پر چیزوں کی طبعیاتی حقیقت کے ذریعے ناپنے کے بعد اِن مسلمانوں نے چند آیات اور احادیث کا مطالعہ کیا۔ ان کے معنی کو تروڑ مروڑ کر ان پر اپنے نئے تصورات کا اِطلاق کیا تاکہ وہ انہیں اپنے مطابق ڈھال سکیں۔ چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد کہ: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ ''اور ہم نے تم کو امتِ وسط بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہوں'' (البقرۃ :143) کے بارے میں مسلمانوں سے کہا کہ امت کو امتِ وسط کی حیثیت نظام اور طریقے میں اعتدال اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ امت میں یہودیوں کی سی زیادتی یا عیسائیوں کی غفلت جیسی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ لفظ

''وسط'' کا معنی ہے عدل اور ان کے دعوے کے مطابق عدل دو متضاد چیزوں میں درمیانی نقطہ نظر اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ سو انہوں نے عدل کو مصالحت کے معنی دے دیے تاکہ سمجھوتے کے تصور کو فروغ دیا جا سکے۔ جبکہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ امتِ مسلمہ عدل پر مبنی ہے۔ اور عادل ہونا اسلام میں گواہوں کی شرائط میں سے ایک ہے۔ یہ امت عدل کے ساتھ دوسری قوموں پر گواہ ہوگی جب یہ اُن کو اسلام کی دعوت دے گی۔ اگرچہ یہ آیت خبریہ انداز میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن اس میں امتِ مسلمہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ وہ دوسری قوموں تک اسلام پہنچائے۔ اگر امت ایسا نہیں کرے گی تو وہ گناہ گار ہوگی۔ اور جیسے محمد ﷺ امتِ مسلمہ پر گواہ ہوں گے یہ امت بھی دوسری قوموں پر گواہ ہوگی۔ جیسا کہ ارشاد ہوا: ﴿**ليكون الرسولُ شهيداً عليكم**﴾ ''تاکہ رسول ﷺ تم پر گواہ ہوں''، یعنی رسول اللہ ﷺ اسلام کو پہنچانے کے معاملے میں لوگوں پر گواہ ہوں گے اور اپنے اس حکم پر کہ یہ امت اس پیغام کو دوسروں تک پہنچائے، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((**أ لا فليبلّغ الشاهدُ الغائب**)) ''ہر حاضر شخص غائب تک (اس پیغام کو) پہنچا دے''۔

ان مسلمانوں نے مندرجہ ذیل آیت کو بھی اپنے حق میں ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے:

﴿**وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا**﴾

''وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ تو فضول خرچی (اسراف) کرتے ہیں اور نہ ہی تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے'' (الفرقان: 67)

چنانچہ انہوں نے خرچ کرنے کی دو انتہائی حدوں کا تعین کر دیا، ایک فضول خرچی اور دوسری کنجوسی، اور انہوں نے ایک درمیانی مقام بھی مقرر کیا یعنی میانہ روی۔ ان کے خیال میں یہ آیت پیسہ خرچ کرنے میں میانہ روی کے فرض ہونے کی دلیل ہے۔ انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ اس آیت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ خرچ کرنے کی تین اقسام ہوتی ہیں: **اسراف**، **التقتير** (کنجوسی)، **قوام** (میانہ روی)۔ اسراف سے مراد حرام چیزوں پر خرچ کرنا ہے خواہ خرچ تھوڑی مقدار میں کیا گیا

ہو یا زیادہ مقدار میں۔ اگر ایک شخص شراب خریدنے، جوا کھیلنے یا رشوت دینے پر محض ایک درہم بھی خرچ کرتا ہے، تو یہ فضول خرچی ہے جو کہ حرام ہے۔ جہاں تک تقتیر (کنجوسی) کا تعلق ہے، تو یہ واجب چیزوں پر خرچ کرنے سے ہاتھ روکنے کو کہتے ہیں۔ اگر ایک انسان اپنے مال پر واجب زکوٰۃ میں سے ایک درہم بھی پیچھے روکتا ہے یا وہ اُن لوگوں پر خرچ نہیں کرتا جن کو نفقہ دینا اس کی ذمہ داری ہے، تو یہ عمل کنجوسی شمار ہوگا۔ اور ایسا کرنا حرام ہوگا۔ جہاں تک میانہ روی کا تعلق ہے، تو شرعی احکامات کے مطابق خرچ کرنے کو قوام (میانہ روی) کہتے ہیں، خواہ خرچ تھوڑی مقدار میں کیا جائے یا زیادہ مقدار میں۔ چنانچہ ایک مسلمان کے لیے اپنے مہمان کی ضیافت کے لیے بکرا، مرغی، یا اونٹ ذبح کرنا میانہ روی سے خرچ کرنا ہی کہلائے گا، جو کہ حلال ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿بَيْــنَ ذَٰلِكَ﴾ ''اس کے درمیان''۔ جو اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خرچ کرنا تین طرح کا ہے: اسراف، کنجوسی اور میانہ روی۔ ان تینوں میں سے ایک چیز کا اللہ نے حکم دیا ہے، جو کہ میانہ روی ہے۔

اسلام میں درمیانی پوزیشن یا سمجھوتے پر مبنی حل کا کوئی وجود نہیں۔ اللہ نے ہی انسان کو تخلیق کیا اور وہ انسان کی حقیقت سے خوب واقف ہے اور اس کا علم ایسا ہے کہ کوئی انسان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ صرف اللہ ہی انسان کی زندگی کے امور کو منظّم کر سکتا ہے اور اللہ کے سوا کوئی ایسا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات کا پہلے سے ہی تعین کر دیا ہے اور ان احکامات میں کوئی درمیانی نقطہ یا سمجھوتہ موجود نہیں۔ بلکہ ان میں کاملیت، صراحت اور منفرد پن پایا جاتا ہے، جنہیں اللہ نے ان احکامات کو واضح اور بالکل درست ہونے کی بنا پر انہیں اپنی حدیں قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾

''یہ اللہ کی حدود ہیں، جو کہ وہ واضح طور پر بیان کرتا ہے، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں'' (البقرة: 230)

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا﴾
''اور جس نے بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اللہ کی مقرر کردہ حدود کو عبور کیا اللہ اسے جہنم کی آگ میں داخل کرے گا، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے'' (النساء: 14)

رسول اللہ ﷺ کے اس جواب میں درمیانی راستہ یا سمجھوتہ کہاں ہے، جو انہوں نے اپنے چچا ابو طالب کو تب دیا، جب ان لوگوں نے اسلام کو چھوڑنے کے بدلے انہیں اعلیٰ عہدے، مال و دولت اور اونچے مقام کی پیشکش کی:

((واللّٰه يا عم لو وضعوا الشمس في يميني والقمر في يساري ان اترك هذا الامر حتى يظهره اللّٰه او اهلك فيه ما تركته))
''اللہ کی قسم! اے چچا! اگر وہ سورج کو میرے داہنے ہاتھ اور چاند کو بائیں ہاتھ پر رکھ دیں کہ میں اس معاملے کو ترک کر دوں، تو میں اسے ترک نہیں کروں گا، یہاں تک کہ اللہ اس دین کو غالب کر دے یا میری جان چلی جائے''

اور جب بنی عامر بن صعصعہ قبیلے نے مطالبہ کیا کہ ان کی طرف سے نصرت دینے کے بدلے میں رسول اللہ ﷺ کے بعد حاکمیت کا حق انہیں ملنا چاہیے، تو رسول اللہ ﷺ کے اس جواب میں ہمیں کونسا سمجھوتہ نظر آتا ہے:

((الامر للّٰه يضعه حيث يشاء))
''یہ اللہ کا امر ہے اور وہ جسے چاہے گا اُسے عطا کرے گا''

چنانچہ درمیانی راستے یا سمجھوتے کا تصور اسلام کے لیے اجنبی ہے۔ مغربی ممالک اور ان کے وفادار مسلمانوں نے اعتدال پسندی اور برداشت کے نام پر اس تصور کو اسلام سے منسوب کر کے اسے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ تاکہ وہ مخلص مسلمانوں کو اسلام کے واضح احکامات اور حدود سے دور کر سکیں۔

5) بنیاد پرستی:

بنیاد پرستی کی اصطلاح سب سے پہلے انیسویں صدی کے آخر میں یورپ میں ظاہر ہوئی۔ اس اصطلاح کو سائنس اور فلسفے میں نئ پیش رفتوں پر چرچ کے ردِعمل اور عیسائیت پر سختی سے کاربند ہونے کے لیے استعمال کیا گیا۔

'پروٹسٹنٹ تحریک' کو بنیاد پرستی کی اساس تصور کیا جاتا ہے۔ اس تحریک نے 1978 میں نیاگرا کانفرنس میں اپنے بنیادی اصول وضع کیے اور پھر 1910 میں جنرل پریس بائی ٹیرین کانفرنس میں ان بنیادی اصولوں کو مزید واضح اور شفاف کیا گیا۔ یہ اصول عیسائی مذہب کے بنیادی اعتقادات پر مبنی تھے، جو سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کی سائنسی پیشرفت سے متصادم تھے، جو کہ دین اور دنیا کی جدائی کے عقیدے پر مبنی ہے۔

اگرچہ دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر یہ تحریک ختم ہوگئی۔ لیکن یہ بات یورپی لوگوں کے دماغ میں سما گئی کہ بنیاد پرستی سائنس اور ترقی کی دشمن ہے۔ اور بنیاد پرستی فکری پستی اور قدامت پسندی ہے جو کہ بیداری کے اس دور سے ہم آہنگ نہیں۔ اور اس کے خلاف تب تک لڑنا لازمی ہے، جب تک معاشرے اور زندگی سے اس کے اثرات ختم نہ کر دیے جائیں۔

چنانچہ عیسائیت کی دنیاوی معاملات سے جدائی کے بعد ہونے والی سائنسی اور صنعتی ترقی کے ردِعمل میں بنیاد پرستی نے یورپ میں جنم لیا۔ یہ تصور اس لیے اُبھرا کیونکہ عیسائیت زندگی کے ان جدید نظاموں کا جواب دینے کے قابل نہیں، جنہوں نے اس سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کے نتیجے میں جنم لیا؛ وہ آئیڈیالوجی جو دین اور دنیا کی جدائی کے عقیدے پر مبنی ہے۔ اس امر نے عیسائی مذہب کے ماننے والوں ایسا رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا کہ انہوں نے مادی ترقی اور سرمایہ دارانہ ثقافت کی مختلف انواع کو بالکل رد کر دیا۔ لیکن بنیاد پرستی کی یہ تحریک ناکامی سے دوچار ہوگئی اور منظرعام سے غائب ہوگئی، جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بنیاد پرستی نے دنیاوی مسائل کے لیے کوئی

عملی حل نہیں دیا، اور دوسرا سبب اس مخالفت کی نوعیت تھی، جو اس تحریک کے قیام کی وجہ بھی تھی، یعنی کہ سائنسی ترقی کی مخالفت اور اس کے ساتھ ساتھ ایسے افکار و تصورات کو روکنے کی کوشش کرنا جن سے عیسائی اتفاق نہیں کرتے یا جن پر وہ یقین نہیں رکھتے ہیں۔

چنانچہ چند عیسائی اور یہودی تحریکوں کو بنیاد پرست قرار دینے والا مغرب ہی ہے۔ یہ لقب ان مذہبی تحریکوں کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کے نفاذ کے بعد ہونے والی تکنیکی، صنعتی، اور سائنسی ترقی کے خلاف ہیں۔

چنانچہ مغربی مفکروں اور سیاستدانوں اور ان سے اتفاق کرنے والے چند مسلمانوں کا مختلف اسلامی تحریکوں اور ان سے منسلک مسلمانوں کو بنیاد پرست قرار دینے کا مقصد ان کے خلاف عالمی رائے عامہ قائم کر کے ان کی مخالفت کرنا اور ان پر حملہ کرنا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کیونکہ ان کے خیال میں بنیاد پرستی کا مطلب دقیانوسی اور منفی ردِعمل کا حامل ہونا اور سائنسی و صنعتی ترقی کی مخالفت کرنا ہے۔

کسی بھی گروہ کو بنیاد پرست قرار دینا اس بات کے لیے کافی ہے کہ اسے نئے دور کی مادی تہذیب اور عام لوگوں کی زندگیوں کے لیے خطرناک تصور کیا جانے لگے۔ اس لقب کی بنا پر اس گروہ کے خلاف ہر قسم کے اقدامات جائز ہو جاتے ہیں، خواہ وہ کتنے ہی سخت کیوں نہ ہوں۔ مصر اور الجیریا جیسے ممالک جب کسی مسلمان کو بنیاد پرست ہونے کی بناء پر قتل کرتے ہیں تو اس عمل کو مغربی رائے عامہ کی حمایت ملتی ہے۔ کوئی بھی انسانی حقوق کی تنظیم اس عمل کے خلاف کھڑی نہیں ہوتی کیونکہ ان کے دعوے کے مطابق قتل ہونے والے بنیاد پرست ہیں۔ انہیں انسانیت کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر تب جب ہر قسم کے بھیانک اقدامات ان سے منسلک کیے جاتے ہیں، جیسا کہ الجیریا میں معصوم لوگوں کا قتل عام اور مصر میں سیاحوں اور کاپٹک عیسائیوں کا قتل۔

بنیاد پرستی کی اصطلاح کے دائرے کو مزید وسیع کر کے ہر ایسی تحریک اور جماعت کو اس میں شامل کر لیا گیا جو خلافت کے دوبارہ قیام اور اسلام سے حکمرانی کے ذریعے مسلمانوں کی بدتر

صورتِ حال اور زندگیوں کو اسلامی زندگی میں تبدیل کرنا چاہتی ہے۔ اس زُمرے میں تمام ایسی تحریکیں بھی آتی ہیں، جو کہ اسلامی علاقوں پر حملہ کرنے اور ان پر قبضہ کرنے والی اقوام جیسا کہ یہودیوں، سربوں، امریکیوں وغیرہ کی مخالفت کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ مسلمان مجاہدین جو ان دشمنوں سے لڑتے ہیں اور ان کی زمینوں پر قبضہ کرتے ہیں، وہ بنیاد پرست اور دہشت گرد ہیں۔ ان میں سے جو لوگ اِن غیر ملکی حملہ آوروں پر وار کرتے ہوئے شہید ہو جاتے ہیں، وہ خودکش اور مجرم ہیں!

یہ تعریف نا انصافی اور قبضے کے خلاف لڑنے والے ہر مسلمان اور ہر تحریک کے لیے خطرناک ہے۔ یہ تعریف ہر اس جماعت کے لیے خطرناک ہے، جو شرعی طریقے کے مطابق اسلامی طرزِ زندگی کی واپسی کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیاد پرستی کی اس تعریف کا مقصد دنیاوی معاملات میں اسلام کی واپس کے لیے کام کرنے والوں پر حملہ کرنے کے لیے قانونی جواز مہیا کرنا ہے۔ اس بہانے کے ساتھ کہ اسلام بھی ان یہودی اور عیسائی بنیاد پرست تحریکوں کی طرح ایک بنیاد پرست تحریک ہے جنھوں نے سرمایہ دارانہ نشاۃِ ثانیہ کے دور میں صنعتی اور سائنسی ترقی کی مخالفت کی تھی۔ اسلامی تحریکوں پر ایک لیبل چسپاں کرنے کے لیے اس اصطلاح کا چناؤ اس لیے کیا گیا کیونکہ مغربی رائے عامہ کے ساتھ اس کی ایک تاریخی نسبت ہے۔ تاکہ مغربی لوگ سیاسی اسلام کی ایک ریاست اور نظامِ زندگی کے طور پر واپسی کے خلاف اپنے حکمرانوں کی حمایت میں ان کے پیچھے کھڑے ہوں۔

کسی بھی مسلمان کو یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ اسلامی تحریکوں کو بنیاد پرست قرار دینے کی وجہ ان اسلامی تحریکوں کا دین کی بنیاد یا فقہہ کی بنیادوں سے وابستہ ہونا ہے۔ اسلامی عقیدہ کی بنیاد اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، آسمانی کتابوں، پیغمبروں، آخرت کے دن پر ایمان ہے۔ فقہ کی بنیاد ان اصولوں پر ہے، جن پر وہ فقہ استوار ہے۔ وہ اصول کہ جنھیں ایک مجتہد تفصیلی دلائل میں سے عمل شرعی احکامات اخذ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

جبکہ مغربی اصطلاحات کے مطابق وہ بنیاد پرستی، جسے عیسائی پروٹسٹنٹ تحریک نے چند

مخصوص مقاصد کے لیے بر پا کیا، کا دورِ حاضر میں یا تاریخی طور پر کسی اسلامی تصور یا اسلامی تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ میں سیاسی تحریکیں، مختلف مکتبہ ہائے فکر اور فقہی مذاہب ضرور سامنے آئے۔ لیکن یہ کسی طرح سے بھی عیسائی بنیاد پرست تحریکوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے ساتویں صدی ہجری میں اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کا مطالبہ کیا، انہوں نے بھی یہ مطالبہ اس لیے نہیں کیا کیونکہ وہ پرانی چیزوں کو محفوظ اور نئی چیزوں کی مخالفت کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایسا اس لیے کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اسلاف نے فقہ پر جو کام کیا ہے، اس میں تمام ایسے مسائل کا حل موجود ہے جو بعد میں آنے والے علماء کو پیش آ سکتے ہیں۔

اسلام ایک منفرد دین ہے جو دوسرے اِلہامی مذاہب سے اس طرح مختلف ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آخری پیغام ہے اور پچھلے پیغاموں کو منسوخ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پیغام کو قیامت کے دن تک اپنی اصل حالت میں برقرار رکھنے کی ذمہ داری خود اٹھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّانَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرِ وِاِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾

''ہم نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں'' (الحجر: 9)

یہ ایک مکمل اور جامع آئیڈیالوجی ہے، جو ایسے عقیدے پر قائم ہے جو کہ عقلی ہے۔ جس سے ایک جامع نظام جنم لیتا ہے، جو قیامت کے دن تک کے لیے تمام انسانی معاملات کو حل کرتا ہے۔ ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ آئیڈیالوجی انسان کو درپیش کسی مسئلے پر شرعی حکم پیش نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَنَزَّلْنَاعَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾

''اور ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے جو دین کی تمام باتوں کو کھول کر بیان کرنے والا ہے'' (النحل: 89)

تاریخ میں اسلامی دنیا کی سائنسی اور صنعتی ترقی اسلام کی دنیا سے جدائی کے نتیجے میں

نہیں عمل میں آئی بلکہ یہ اسلام کے مکمل نفاذ کا نتیجہ تھی۔ آج کے دور میں پائے جانے والی زیادہ تر سائنسی اور صنعتی ترقی اُن مسلمان مفکرین کی بدولت ہے جنہوں نے اسلامی طرزِ زندگی اور اسلامی ریاست کے سائے تلے ان ایجادات اور علوم کے بنیادی قوانین اور نظریات پیش کیے۔

چنانچہ اسلام اور اسلامی تحریکوں کو اُسی طرح بنیاد پرست قرار دینا جیسے عیسائی تحریکوں کو قرار دیا گیا تھا، غلط ہے اور تعصب پر مبنی ہے۔ اس تعریف کا اسلام کی حقیقت پر اطلاق نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی ایسے شخص پر اطلاق ہوتا ہے، جو اسلام کو زندگیوں میں واپس لانے کے لیے کوشش کر رہا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص اس خستہ حالی اور دگرگوں صورتِ حال کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہے ،جس میں آج مسلمان مبتلا ہیں ۔ دنیاوی معاملات میں انسان کی تخلیق کردہ نظام کی حاکمیت کا نتیجہ ہے۔ یہ مقصد عیسائی بنیاد پرست تحریکوں کے کام کے برعکس ہے، جو اس طرزِ زندگی کو محفوظ بنانے کے لیے عمل میں آئیں جس کے تحت عیسائی سرمایہ داریت سے پہلے رہتے ہیں۔

چنانچہ مغرب کا اسلامی تحریکوں کو بنیاد پرست قرار دینا اسلام کی ایک مکمل نظام کے طور پر واپسی کے خلاف جنگ کے علاوہ کچھ نہیں۔ مغرب کے لیے یہ ایک سٹریٹیجک معاملہ ہے بلکہ یہ مغرب کی نہایت اہم ضرورت ہے۔ وہ تیسری دنیا کے ممالک خاص طور پر اسلامی دنیا کو غیر ترقی یافتہ اور نشاۃِ ثانیہ سے دُور رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سب خلافت کے دوبارہ قیام کو روکنے کے لیے ہے، جو کہ ان کے نظام کو اکھاڑ پھینکے گی اور ان کے برے ارادوں اور لالچ کا خاتمہ کردے گی۔

انہیں لوگوں میں سے ایک کا بیان سنیے، جو کہ ہاورڈ یونیورسٹی میں مشرقِ وسطیٰ کے علوم کا وزیٹنگ سکالر ہے۔ اس نے امریکی کانگرس کو ایک رپوٹ جمع کروائی جس میں اس نے کہا:''بنیاد پرستوں کا خیال ہے کہ شریعت کا اپنی تمام تر باریکیوں سمیت اطلاق ہونا چاہیے اور یہ کہ اللہ کے تمام احکامات کا مکمل نفاذ لازمی ہے اور یہ تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ اسلام ہی مسلمانوں کی طاقت کا منبع ہے اور شریعت آج بھی اسی طرح قابلِ نفاذ ہے، جیسے وہ ماضی میں تھی''۔ اس نے یہ بھی کہا ''بنیاد پرست مغربی تہذیب سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ اور وہ اسے اسلامی احکامات کے نفاذ

کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں''۔ امریکی سکالر John Esposito نے امریکی کانگرس کو ہی جمع کروائی گئی ایک رپورٹ میں کہا: ''امریکی مفادات کو سب سے زیادہ خطرہ جن سے ہے، وہ مسلم بنیاد پرست ہیں''۔

چنانچہ کفار جس بنیاد پرستی کو حملے کا نشانہ بناتے ہیں، وہ دراصل اسلامی شریعت کا زندگی میں دوبارہ نفاذ ہے۔ اگر یہی بنیاد پرستی ہے، تو ان کی تعریف کے مطابق تمام مسلمان بنیاد پرست کہلائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام مسلمان اشتیاق اور ولولے کے ساتھ خلافت کے سائے تلے اسلامی احکامات کے مکمل نفاذ کے لیے بے تاب ہیں، جو اُنہیں اور باقی دنیا کو سرمایہ دارانہ نظام کی مصیبت سے بچائے اور انہیں اسلام کی شان وشوکت کی طرف واپس لے جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَى اِلَى الاِ سْلَامِ وَاللّٰهُ لاَ يَهْدِي الْقُوْمَ الظَّالِمِيْنَ يُرِيدُوْنَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ﴾

''اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، جبکہ اس کو اسلام کی طرف بلایا جارہا ہے؟ اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ وہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے ہیں، جبکہ اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو''

عالمگیریت (گلوبلائزیشن):

'عالمگیریت' کے لفظ کی ، آج کے دور کی اصطلاحات میں مثال ویسی ہی ہے جیسے کپڑوں میں لفظ 'جلباب' کی یا فوجی ٹیکنالوجی میں لفظ ''Trojan Horse'' کی مثال ہے۔ یہ اصطلاح اپنے اندر پائے جانے والی چیزوں کو چھپاتی ہے تاکہ لوگ انہیں سمجھ نہ سکیں۔ عالمگیریت

کے پیچھے واقعی بہت کچھ چھپا ہے۔

اس بات کا سب سے واضح اشارہ ہمیں بیروت میں 1997 کے آخر میں Center for the study of Arab unity جو کہ عرب قوم پرستوں کی باقیات ہے، کی جانب سے منعقد کردہ ایک کانفرنس سے ملتا، جو کہ عالمگیریت کا مطالعہ کرنے اور اس کے بارے میں درست رویہ ڈھونڈنے کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ اُنہیں عالمگیریت کا تصور قوم پرستی کے برعکس اور قومیت کے لیے خطرناک لگا۔ کانفرنس کی دعوت دیتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا گیا تھا کہ اس میں کیا معاملہ زیرِ بحث ہوگا: ''عالمگیریت کی سمجھ، عالمگیریت کے معاشی، ثقافتی اور سیاسی میدانوں میں رونما ہونے سے نبٹنے کے لیے عرب ممالک کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ عالمگیریت کا تاریخی طور پر، موجودہ دور میں اور مستقبل میں کردار، بالخصوص سوویٹ یونین کے ٹوٹنے اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد عالمگیریت کے متعلق امریکہ کا رویہ اور اس رویے کا عرب ممالک کے ثقافتی ماحول اور ان کی پہچان کے ساتھ ساتھ عربوں کے معاشی نظام اور سرمایہ کاری پر اس کا اثر''۔

بہت سے مفکروں اور یونیورسٹی کے پروفیسروں کو اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی اور انہوں نے عالمگیریت کے متعلق اپنی فہم کا اظہار کیا اور یہ کہ عالمگیریت کے بارے میں مناسب رویہ کیا ہونا چاہئے۔ مقامی اخباروں نے تین دن تک جاری رہنے والی اس کانفرنس کے شرکاء کی جانب سے پیش کیے گئے مضامین کے مختصر حصے شائع کیے۔ جلد ہی ان مطالعوں میں بہت سے اختلاف پیدا ہو گئے اور یہ کانفرنس ایک فکری کانفرنس کی بجائے بہرے لوگوں کے مابین ہونے والا مکالمہ بن کر رہ گئی۔ کانفرنس کا اہتمام کرنے والوں نے کوئی تجاویز یا حل پیش کئے بغیر ہی اس کانفرنس کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

عالمگیریت کی اصطلاح کو انگریزی اور فرانسیسی زبان میں تقریباً دس سال پہلے شامل کیا گیا۔ اس اصطلاح کو کسی بھی چیز کو عالمی قرار دیے جانے کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا کہ وہ دنیا

کے بیشتر حصوں میں موجود ہے، بلکہ یہ ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ ایک عمل کو کرنے والا اس عمل کو عالمی بنانا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک کمپنی ایک ایسی صنعتی پالیسی اپنائے جس کے تحت وہ پوری دنیا کو اپنے مال کی پیداوار کیلئے موزوں سمجھے گی۔ اس کے بعد وہ کسی بھی ایسے ملک یا ممالک میں پیداوار شروع کر دے گی، جہاں اخراجات دوسری جگہوں سے کم ہوں، تب یہ کہا جا سکتا ہے کہ کمپنی نے اپنی پیداوار کو عالمگیر کر دیا ہے۔ اس طرح کی باتیں اس کمپنی کے اقدامات کے متعلق بھی کہیں جائیں گی، جب وہ اپنے مال کی خرید و فروخت اور مشہوری، نئ اشیاء کے متعلق معلومات اکٹھی کرنے، انہیں بنانے، مزدوروں، پیشہ وروں یا منتظمین کو بھرتی کرنے یا ایسے سرمایہ کاروں اور مالیاتی امور کے ماہرین کو ڈھونڈنے جو کمپنی کے امور چلانے کے لیے قرضہ فراہم کریں، میں عالمگیریت کی پالیسی اپنائے۔

لفظ 'گلوبلائزیشن' کو پہلی دفعہ 1980 کی دہائی کے دوران بڑی امریکی کمپنیوں کی سرگرمیوں کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ رونلڈ ریگن جب 1981 میں امریکہ کا صدر بنا تو اس نے عالمی تعلقات میں معاشی اور سیاسی میدان میں دلیرانہ پالیسیاں اپنائیں، اور امریکی اقتصادی حلقوں کی مضبوط تائید حاصل کر لی۔ اس پروگرام کا ایک حصہ یہ تھا کہ امریکی ڈالر کے ذریعے غیر ملکی سرمایہ کاروں کی دولت کو کھینچا جائے تاکہ وہ امریکی بجٹ کے Debt Bonds میں اپنا پیسہ لگائیں اور اس وقت کے سوویٹ یونین کو ہتھیاروں کی ڈور میں تھکایا جا سکے۔ یہی حکمت عملی 1998 میں کمیونزم کی معاشی تباہی کا باعث بنی۔

اس پالیسی کی وجہ سے ریگن کی صدارت کے پہلے دور میں ڈالر کی قیمت میں لگاتار بڑے اضافے دیکھنے میں آئے، یہاں تک کہ ڈالر کے ایکسچینج ریٹ کا انڈیکیٹر، جسے دوسری ممالک کی کرنسیوں کے ساتھ موازنے کے ذریعے ماپا جاتا ہے اور امریکہ کے ساتھ تجارت کے دوران ان کرنسیوں کے ادل بدل سے اس کا اندازہ لگایا جاتا ہے؛ فروری 1985 میں 159 پوائنٹ تک پہنچ گیا۔ جبکہ امریکی صدر ریگن کے پہلے دورِ حکومت کے دوران یہ 91 پوائنٹ تھا۔ یہ ریگن کا سیاسی داؤ تھا کہ اس نے ڈالر کو مضبوط کرنے کی پالیسی کے منفی اور فروعی نتائج کو نظر انداز کر دیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا سارا دھیان سرمایہ داریت کو کمیونزم پر فتح دلانے پر تھا۔ ڈالر کو مضبوط کرنے کی وجہ سے امریکہ کی دوسرے ممالک میں بنائی جانے والی اشیاء سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت کم ہوگئی چنانچہ امریکی برآمدات میں کمی اور درآمدات میں اضافہ واقع ہوا۔ نتیجتاً ریگن کے دورِ صدارت میں بیرونی تجارت کا خسارہ بہت تیزی سے بڑھا اور اس کی صدارت کے آخری دور میں یہ خسارہ 723 بلین ڈالر تک جا پہنچا، جو کہ اس وقت سے صرف آٹھ سال پہلے چار بلین ڈالر تک تھا۔

مضبوط ڈالر کا ایک اور منفی اثر یہ پڑا کہ امریکی اشیاء، کہ جن کی قیمتیں ڈالروں میں تھی، اور غیر ملکی اشیاء کے مابین سخت مقابلے کی وجہ سے بہت سی امریکی کمپنیوں کے منافعوں میں کمی واقع ہوئی۔ ان کمپنیوں کو مجبوراً اپنی مصنوعات کی قیمتیں گھٹانا پڑیں اور سنجیدگی سے اخراجات کم کرنے کے طریقے ڈھونڈنے پڑے، خاص طور پر انہیں امریکہ میں مزدوری کے اخراجات پر غور کرنا پڑا۔ پھر اس وقت امریکی پرفیسروں کے ایک گروہ نے یہ تجویز پیش کی کہ ان کمپنیوں کو صنعتی پیداوار، مارکیٹنگ اور دیگر میدانوں میں اپنی سرگرمیوں پر بنیادی نظر ثانی کرنی چاہئے اور اپنی ازسرنو تشکیل کرنی چاہیے۔ یہ تجویز امریکہ کے کاروباری حضرات اور سرمایہ کاروں میں بہت مقبول ہوئی۔ اس کے نفاذ کی بدولت امریکی کمپنیوں کی بہت سی شاخیں اور کارخانے بند ہوگئے۔ اور ان کمپنیوں کے بہت سے مزدور اور ملازم اپنی نوکریوں سے نکال دیے گئے۔ اس کی ایک مثال امریکہ میں گاڑیاں بنانے والی بڑی کمپنیوں سے ایک کمپنی، جنرل موٹرز، کا وہ اعلان ہے جس کے تحت 74000 ملازموں کو ایک ساتھ نوکری سے نکال دیا گیا۔ آئی بی ایم نے، جو کہ سب سے بڑی کمپیوٹر کمپنیوں میں سے ایک ہے، تھوڑے عرصے کے اندر اندر 60,000 ملازموں کو تین مرحلوں میں نکال دیا۔

ازسرنو تشکیل کے بعد یہ کمپنیاں ان کارخانوں کی صنعتی پیداوار دوبارہ بحال کرنے میں کامیاب ہوگئیں جنہیں بند کر دیا گیا تھا یا ان کے حصوں کو فروخت کر دیا گیا تھا۔ یہ سب ممکن بنانے کے لیے امریکہ سے باہر نئی شاخیں کھولی گئیں اور کارخانے قائم کیے گئے اور امریکہ کے اندر

ایسی نئی چھوٹی کمپنیوں کے ذریعے صنعتی پیداوار حاصل کی جائے، جو اپنے ملازموں کو کم تنخواہیں دیتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مضبوط ڈالر کی وجہ سے دوسرے ممالک کی تنخواہیں اور کاروباری لاگت بہت کم ہوگئی تھی۔ امریکی کمپنیوں نے پاکستان، انڈونیشیاء، فلپائین، تھائی لینڈ اور بھارت جیسے غریب اور زیادہ آبادی والے ممالک پر توجہ مرکوز کی، جہاں ایک مزدور کی ماہانہ تنخواہ ایک امریکی کارخانے میں کام کرنے والے مزدور کی تقریباً چند گھنٹوں کی تنخواہ کے برابر تھی۔ یہ حال صرف مزدوروں کا ہی نہیں تھا بلکہ انجینیئر اور کمپیوٹر پروگرامرز جیسے پڑھے لکھے لوگ بھی ان میں شامل تھے ،خواہ ان کا تعلق کسی بھی ملک سے ہو،اور جب تک کہ ان لوگوں کو ملازمت اور تنخواہوں کی سخت ضرورت تھی اور جب تک ان کی تنخواہیں امریکی معیار سے بہت کم تھیں۔

کمپنیوں کی تشکیلِ نو کے اس عمل اور ایک ساتھ بہت بڑی تعداد میں ملازمین کو فارغ کرنے کے واقعات نے امریکہ میں ایک سیاسی شوروغل برپا کردیا، بہت سے امریکی ملازمتوں کو دوسرے ممالک میں برآمد کرنے کے اس عمل کے متعلق یہ سوچتے تھے کہ انہیں ملازمتوں سے محروم رکھا جارہا ہے اور ان کے روزگار پر حملہ کیا جارہا ہے اور ان کا خیال تھا کہ اس عمل کی اصل وجہ ان سرمایہ دارانہ کمپنیوں کا لالچ ہے۔ کمپنیوں کا جواب یہ تھا کہ انہیں سخت عالمی مقابلے کی وجہ سے مجبوراً سب کچھ کرنا پڑا اور ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ عالمی سطح پر مقابلہ کریں اور اپنی سرگرمیوں کو ''گلوبلائز'' کریں۔ کانگرس کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے امریکی کمپنیوں کے گلوبلائزیشن کے عمل کی جانچ پڑتال کے لیے عوامی سطح پر میٹنگز منعقد کیں۔ جن میں سے پہلی 1987 میں ہوئی اور آخری 1992 میں منعقد کی گئی۔ عوامی سطح پر لیے جانے والے اس جائزے کے نتیجے میں عالمگیریت کا تصور کافی مشہور ہوگیا۔ جب ان کمیٹیوں نے 1987 اور بعد کے سالوں میں شائع کردہ رپورٹوں کی سرخیوں میں اس اصطلاح کو استعمال کیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ 'عالمگیریت' کی اصطلاح کو انگریزی کی کسی رپورٹ یا کتاب کے سرورق میں استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد عالمگیریت کے عنوان پر بہت سی کتابیں شائع ہوئیں یہاں تک کہ انگریزی میں شائع شدہ مواد 260 کتابوں تک جا پہنچا جن میں سے بہت سی کتابیں 1990 کی دہائی میں کلنٹن کے

دورِ صدارت کے دوران شائع ہوئیں۔

تاہم اس جانچ پرتال کا مقصد کمپنیوں کی طرف سے ملازمتوں سے لوگوں کو فارغ کرنے اور اپنی پیداواری سرگرمیوں کو امریکہ سے باہر منتقل کرنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی دباؤ کو راستہ فراہم کرنا تھا، تاکہ اپنے ان اقدامات کا جواز فراہم کیا جائے اور کمپنیوں کے خلاف میڈیا کے اندر اور میڈیا کے پیدا کردہ اس دشمنانہ ماحول کو ختم کیا جائے۔ ان تفتیشوں کا سلسلہ 1992 میں ختم ہوگیا اور دوبارہ ان کا آغاز نہیں کیا گیا، باوجود یہ کہ 1992 کے آخر میں ہونے والے صدارتی انتخابات میں ان معاملات کو اٹھایا گیا تھا۔ طاقت میں آنے کے بعد کلنٹن نے NAFTA معاہدے کو تسلیم کر لیا جو بش سینئر نے کینیڈا اور میکسیکو کے ساتھ کیا تھا۔ اس معاہدے کے تحت امریکی اور کینیڈین کمپنیوں کو یہ اجازت مل گئی تھی کہ وہ میکسیکو میں ہر قسم کی مصنوعات کو تیار کر سکتی ہیں، جہاں مزدوروں کی تنخواہیں بہت کم ہیں اور ان اشیاء کو امریکی اور کینیڈین منڈیوں میں فروخت کر سکتی ہیں۔ یہ وہی تھا جس بات کا ان کمپنیوں کی مخالفت کرنے والے امریکی سیاسی ڈھڑوں اور مزدور انجمنوں کو ڈر تھا۔

چنانچہ بڑی تعداد میں لوگوں کو نوکریوں سے نکالنے اور نوکریوں کی امریکہ سے باہر برآمد کے خلاف پایا جانے والا سیاسی شوروغل، جس کے سبب عالمگیریت کی اصطلاح نے مزید شہرت پائی، 1992 کے آخر تک بالکل غائب ہوگیا۔ یہ شور امریکی مالیاتی اداروں اور ان کے تحت کام کرنے والی کمپنیوں کے حق میں ختم ہوا۔ اس تمام کے نتیجے میں بالآخر یہ رائے عامہ قائم ہوئی کہ ایسی نوکریاں امریکی سرزمین سے باہر نہیں جانی چاہئیں جن کے لیے کافی زیادہ اور تجربہ درکار ہو اور جن کی تنخواہیں بھی اچھی ہوں۔ اگر کوئی کام باہر منتقل بھی کیا جائے تو وہ صرف ایسی نوعیت کا ہونا چاہیے جس میں جسمانی محنت درکار ہو، یا جس میں تھکا دینے کی حد تک یکسانیت ہو اور جس کی تنخواہ بھی کم ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہ توقعات پوری ہوگئیں تو تمام امریکیوں کو فائدہ ہوگا، کیونکہ اس وجہ سے وہ نئے دور کی صنعتوں اور زیادہ قابلیت، زیادہ تجربے اور زیادہ تنخواہوں والی نوکریوں میں مہارت حاصل کر پائیں گے۔ ساتھ ساتھ برآمد شدہ نوکریوں کا مطلب یہ ہوگا کہ ملک سے

باہر سستے ہاتھوں سے بنائی اور اسمبل گئی مصنوعات بہت تھوڑی قیمتوں پر امریکی منڈیوں میں واپس لوٹیں گی۔

1992 میں اس مسئلے کے سیاسی حل اور 1993 میں کلنٹن کے اقتدار میں آنے کے بعد امریکی خارجہ اور معاشی پالیسیوں میں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ کلنٹن کے پیش رو بش نے مصنوعات کی برآمد اور GATT کی بجائے ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے قیام کو فنڈ کرنے کی پالیسی اپنائی تھی، تاکہ اشیاء کی برآمدات کے دروازے کھولے جائیں۔ لیکن امریکی سرمایہ داروں اور مالیاتی حلقوں کا یہ خیال تھا کہ مصنوعات کی برآمد کو فروغ دینے سے زیادہ ضروری اُس کام کو مکمل کرنا ہے جو انہوں نے 1980 کی دہائی میں شروع کیا تھا، یعنی امریکی کمپنیوں کی جامع انداز میں ازسرِنو تشکیل، تاکہ وہ منافع کمانے کے زیادہ قابل ہوجائیں۔ ان کی رائے تھی کہ اس کام سے نہ صرف ان کی مصنوعات کی برآمدات بلکہ ان کی نوکریوں کی برآمدات میں بھی بے پناہ اضافہ ہوگا بلکہ وہ غیر امریکی کمپنیوں کے ساتھ سخت مقابلہ بھی کرسکیں گی۔

امریکی سرمایہ داروں نے کئی دوسری تجاویز بھی کلنٹن کو پیش کیں، جن پر وہ عمل درآمد کرانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ امریکہ کئی سالوں سے سرد جنگ اور دوسرے عالمی مسائل کا بوجھ اور اخراجات اٹھاتا چلا آرہا ہے۔ اس کے نتیجے میں یورپ اور جاپان معاشی طور پر اتنے مضبوط ہوگئے ہیں کہ اب وہ امریکہ کے اہم مفادات کے لیے خطرہ بن گئے تھے۔ پس اب جبکہ سرد جنگ کا اختتام ہوچکا ہے تو امریکہ کو ہر حالت میں دوبارہ یورپ اور جاپان سے مقابلے کرنے کی صلاحیت حاصل کرنی چاہئے، اور اسے دوبارہ ایک غالب قوت کے انداز میں یہ مقابلہ کرنا چاہیے۔ امریکہ کو ماضی کی طرح یورپ اور جاپان کے مفادات کو اپنانے اور ان کا تحفظ کرنے کے ضرورت نہیں ہے۔ چند امریکی ماہر مالیات نے یہاں تک کہا کہ امریکہ کو یورپ اور جاپان اور ان کی کمپنیوں کی معاشی جاسوسی کرنے کے لیے اپنی خفیہ ایجنسیوں کا استعمال کرنا چاہیے، کیونکہ اب سرد جنگ اور دوسرے سیاسی معاملات میں امریکہ کی مصروفیات کم ہوچکی ہیں۔

ان خیالات اور آراء کے نتیجے میں کلنٹن اور اس کا سکیرٹری برائے خزانہ، مسٹر روبن، جو کہ وال سٹریٹ کی بڑی شخصیات میں سے ایک تھا، نے عالمی منڈیوں کو کھولنے کے اِس مطالبے کو اختیار کر لیا۔ اس مطالبے کا مقصد امریکی مصنوعات کے لیے منڈیاں فراہم کرنا ہی نہ تھا بلکہ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ امریکی کمپنیوں کو جہاں بھی سستی لیبر مہیا ہو، وہ وہاں اپنی مصنوعات کو تیار کریں اور اپنی صنعتی مصنوعات اور سہولیات کو امریکہ اور دوسرے ممالک غرض کسی بھی عالمی منڈی میں مارکیٹ کر سکیں۔ ان میں سے سب سے اہم قدم پیسے کی غیر ملکی مارکیٹوں میں امریکی مالیاتی کمپنیوں کی سرگرمیوں کے پلان کو اختیار کرنا تھا، جن میں بینک، انشورنس کمپنیاں اور بروکریج ہاؤسز شامل ہیں۔ یہ ایک نیا معاملہ تھا کیونکہ ان کمپنیوں نے اس سے پہلے دوسرے ممالک میں زیادہ کام نہیں کیا تھا اور انہیں اپنے اقدامات سے پیدا ہونے والے خطروں کی وجہ سے ان ممالک میں خوش آمدید نہیں کہا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان مالیاتی کمپنیوں کا طریقہ واردات ہی یہ تھا کہ یہ ڈیپازٹس، انشورنس پریمیئم، شیئرز اور بانڈز کے ذریعے لوگوں کے پیسے اپنی جانب کھینچتی تھیں۔ نتیجتاً ان کے ہاتھوں میں دولت کی ایک بڑی مقدار جمع ہو جاتی تھی، اور پھر وہ اس دولت کو جیسے اور جہاں چاہے استعمال کرتی تھیں۔

امریکی سرمایہ دار سرد جنگ کے ختم ہونے کے فوراً بعد پیش کیے جانے والے اس خیال سے بہت پریشان ہو گئے کہ دنیا آخر کار تین بڑے معاشی خطوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ پہلا خطہ پورے یورپ پر مبنی ہو گا اور یہ مغربی یورپ کے کنٹرول میں ہو گا۔ دوسرا خطہ ایشیاء کے زیادہ تر علاقوں پر مبنی ہو گا اور اس پر جاپان کا غلبہ ہو گا۔ تیسرا خطہ دونوں امریکی براعظموں پر مشتمل ہو گا اور امریکہ کا تسلط اس تک محدود ہو گا۔ انہیں ڈر تھا کہ یہ خیال کہیں حقیقت نہ بن جائے، سو اس لیے انہوں نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور اسے علاقائیت قرار دیا۔ انہوں نے اس حقیقت کو جان لیا کہ یورپ اور جاپان اس خیال کو پھیلانے میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ انہوں نے اس کے متبادل ایک تصور پیش کیا کہ پوری دنیا کو ایک عالمی منڈی بن جانا چاہیئے۔ کسی ایک ملک کی کسی خطے پر اجارہ داری نہیں ہونی چاہیے بلکہ ہر ملک کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ

وہ دنیا کے کسی بھی علاقے میں کاروبار کے میدان میں مقابلہ کر سکے۔ انہوں نے ایک سوچی سمجھی میڈیا مہم کے ذریعے اس تصور کو فروغ دیا۔ کلنٹن انتظامیہ نے اس تصور کو اپنایا اور اس کے متعلق بہت سی کتابیں منظرِ عام پر آئیں جن میں کمپنیوں کی سرگرمیوں کو عالمی سطح پر لے جانے کے متعلق بات کی گئی تھی۔

جب کلنٹن انتظامیہ نے اپنے دورِ حکومت کے آغاز میں اس تصور کو خود اپنا لیا تو یہ میڈیا مہم امریکہ میں اختتام پزیر ہوگئی۔ اور پھر اس مہم کو امریکی انتظامیہ اور ریاستی تنظیموں کی پشت پناہی سے امریکہ سے باہر شروع کیا گیا۔ خاص طور پر ان ممالک میں جنہیں ترقی پذیر ممالک کہا جاتا ہے۔ یہ میڈیا مہمات تیز کر دی گئیں اور ان مہمات نے ان ممالک میں رہنے والے لوگوں کو سطحی اور پُر فریب افکار، کمزور باتوں اور عجیب وغریب باطل دلیلوں میں مصروف کر دیا۔ بہت سے لوگ ان تصورات سے بالکل مسحور ہو کر رہ گئے۔ حالانکہ جن تصورات کی طرف ان مہمات کے ذریعے دعوت دی جا رہی تھی وہ نہایت احمقانہ تھے۔ ان مہمات کو بہت سوچ بچار اور توجہ کے ساتھ جاری رکھا گیا تا کہ ان ترقی پذیر ممالک میں رائے عامہ کو تبدیل کر کے امریکی کمپنیوں کے مفاد کے لیے استعمال کیا جائے تا کہ امریکہ سرد جنگ جیتنے کا پھل حاصل کر سکے اور یہ کمپنیاں ان ممالک میں اجارہ داری حاصل کر لیں اور یورپی اور جاپانی کمپنیوں کو مقابلے سے باہر کر دیں۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ یہ بات واضح ہے کہ یہ مہمات اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہیں اور انہیں کے ذریعے وہ حکمران، جو مغرب اور مغربی ثقافت کے اثر میں ہیں، اپنے ممالک پر امریکی کے اس نئے حملے اور یلغار سے قبل اپنے لوگوں کو بیوقوف بنا کر چپ کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ حکمران اب امریکی مصنوعات کے لیے اپنی منڈیاں کھول رہے ہیں، اپنی سستی لیبر امریکی کارخانوں میں بھرتی کروا رہے ہیں، جو کہ لوگوں کی جمع پونجی کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور کاروباری پیشین گوئیوں کے لیے امریکہ کی پیسے کی منڈی کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

عالمگیریت کہ جسے امریکہ دیگر ممالک میں بالخصوص تیسری دنیا کے ممالک میں پھیلا رہا ہے، کے نقاب کے پیچھے چھپے ہوئے افکار میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

1) سوویٹ یونین کے خاتمے کے بعد دنیا میں صرف مغربی معاشی نظام باقی رہ گیا، جسے اس کے اصل نام، یعنی سرمایہ داریت کی بجائے آزاد تجارتی نظام کے نام سے پیش کیا گیا۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جو ہمیں اس کے لالچ اور اس کی مکروہ شکل وصورت کی یاد دلاتا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک یا تو اس نظام کو نافذ کر چکے ہیں، یا اسے نافذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

2) عالمی سرمایہ اور پیسوں کی آمدورفت اب یونٹری unitary بن چکے ہیں، کیونکہ اس کے کرتا دھرتا اب پیسہ کسی بھی ملک میں منتقل کر سکتے ہیں اور اسے سرمایہ کاری کی کسی بھی شکل و صورت میں استعمال کر سکتے ہیں، جس کا منافع دیگر سرمایہ کاریوں کے مقابلے میں زیادہ ہو۔ پیسوں کا تبادلہ اب حیران کن رفتار سے کیا جا سکتا ہے، جو کہ کمیونیکیشن کے تیز ذرائع کی بدولت ممکن ہوا اور پیسہ کسی ایسے ملک میں سرمایہ کاری کے لیے نہیں لگایا جائے گا جو سرمایہ کاری کے راستے میں رکاوٹیں اور دیواریں کھڑی کرتا ہو۔

3) کاروباری دنیا بھی اب متحد ہو چکی ہے، اسی وجہ سے بین الاقوامی کمپنیاں ابھر کر سامنے آ رہی ہیں۔ حالانکہ یہ اصل میں بین الاقوامی نہیں ہیں، کیونکہ ان کمپنیوں کا تعلق بنیادی طور کسی ایک ملک سے ہی ہوتا ہے اور ان کمپنیوں کی قومیت بھی ایک ہی ہوتی ہے۔ ان کمپنیوں کے پاس یہ قابلیت ہے کہ یہ عالمی سطح پر مصنوعات کی تیاری کر سکتی ہیں اور ان مصنوعات کو تمام دنیا میں دستیاب کر سکتی ہیں، جو کہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی بدولت تمام ایسے ممالک جو ترقی کرنا چاہتے ہیں، ان کمپنیوں کو خوش آمدید کہتے ہیں، تاکہ یہ کمپنیاں ان کے لوگوں کو نوکریاں دیں اور اپنی مصنوعات ان ممالک میں فروخت کریں، ورنہ یہ کمپنیاں دوسرے ممالک میں چلی جائیں گی۔

4) دنیا کے تمام کونوں میں رہنے والے افراد کے مابین عالمی روابط اس حد تک وسیع اور مربوط ہو چکے ہیں کہ کوئی بھی گروہ یا ریاست انہیں کنٹرول نہیں کر سکتی۔ ان روابط کی بدولت لوگ آپس میں معلومات کا تبادلہ کر سکتے ہیں چنانچہ لوگوں کی آراء اور پسند بھی ایک جیسی ہو چکی ہیں۔

یہ عالمگیریت کے چند وہ تصورات ہیں جنہیں تیسری دنیا کے ممالک میں فروغ دیا جا رہا

ہے۔ انہیں فروغ دینے کا مقصد یہ ہے کہ ان کی بنیاد پر ثابت کیا جا سکے کہ ملک میں غیر ملکی پیسے اور نوکریاں لانا ضروری ہے۔ ایک مقصد یہ بھی ہے کہ عالمگیریت کی وکالت کرنے والوں کی تجویز پر عمل کیا جائے کہ ان ممالک کو اپنے قوانین تبدیل کرنے چاہئیں اور اپنے سرکاری اداروں کی نجکاری کر دینی چاہیے تاکہ یہی لوگ ان اداروں کو خرید سکیں۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ بھی دنیا کے اس مشترکہ مارچ میں شامل ہو جائیں، جو پیسے اور نوکریوں کو گلوبلائز کرنے کے تصور کو تسلیم کر چکی ہے، ورنہ مسلمان ترقی پذیر ہی رہیں گے۔

کسی کو بھی ان دعوؤں، پراپگنڈے اور باطل دلیلوں کے اثرات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی عالمگیریت کے اس نقاب کو نظر انداز کرنا چاہئے جو ایسے ممالک سے عالمگیریت کی حقیقت کو چھپاتا ہے جہاں ایسے حکمران اور مفکر موجود ہیں، جن کی عوام پر جاہلوں کا تسلط ہے اور جو اپنی آراء کے لیے سرکاری میڈیا پر انحصار کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کوئی ایسی حیران کن بات نہیں کہ ہم عالمگیریت کے ان دعوؤں کا موازنہ انیسویں صدی کے مشنری حملے سے کریں۔ اس دفعہ کا یہ حملہ سابقہ یلغار سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس دفعہ اس نے مذہب کا نقاب نہیں پہن رکھا، اگرچہ یہ ماضی کی نسبت زیادہ بھیانک ہے۔